A-PDF Merger DEMO : Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیاد گار: امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا دینی، علمی، اصلاحی و ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

جنوری رفروری ۲۰۱۶

جلد نمبر ۱۷

شمارہ نمبر ۶

سلسلہ نمبر ۱۷۰

بانی: فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ

مدیر: سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

مجلس ادارت

مولانا عبد الرشید بستوی
09634506041

مولانا فضیل احمد ناصری
08881347125

نگراں ترسیل

مولانا ابوطلحہ اعظمی
09997504588

اشتراک وتعاون

اندرونِ ملک:
فی شمارہ -/15 سالانہ -/150
خصوصی -/1000
تاحیات -/10000

بیرونِ ملک:
سالانہ: 20 امریکی ڈالر
خصوصی: 100 امریکی ڈالر
تاحیات: 500 امریکی ڈالر

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 09412496763-08006075484

ای میل: jimask94@gmail.com, ahmadanzarshah@gmail.com

مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہر قسم کی چارہ جوئی کا حق صرف عدالت دیوبند کو ہی ہوگا۔

Composed By: Umar Ilahi DBD. 09358013409

ورق در ورق

صریر خامہ

عصریات — سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری — ۳

نوادرات امام کشمیریؒ

مشکلات القرآن — مولانا محمد مزمل بدایونی — ۶

قرطاس و قلم

غیر مسلموں کے تعلقات... — مولانا محمد یحییٰ نعمانی — ۱۳

ضعیف احادیث اور ان کا حکم — مولانا محمد نجیب قاسمی — ۱۹

کامیاب تاجر — مولانا نسیم اختر شاہ قیصر — ۲۳

عالمِ اسلام کے خلاف شیعوں کی ریشہ دوانیاں — مولانا مفتی وصی احمد قاسمی — ۲۵

شخصیات

حضرت عثمان ذی النورینؓ — مولانا عبدالرشید بستوی — ۳۶

حضرت مولانا وکیل احمد شیروانی: جوارِ رحمت میں — محمد قاسم لوہاروی — ۴۲

دیوبند کے دو سپوت — ڈاکٹر عبید اقبال عاصم — ۴۴

حالاتِ حاضرہ

ایران و سعودی کشمکش — ایم ودود ساجد — ۵۲

فقہ و فتاویٰ — مولانا مفتی نثار خالد قاسمی — ۵۵

جامعہ کی سرگرمیاں — مولانا فضیل احمد ناصری القاسمی — ۵۸

تبصرہ و تعارف — مولانا عبدالرشید بستوی — ۶۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصریات

✤ سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

بہت سے مسلم وغیر مسلم دانشوروں اور تجزیہ کاروں کا یہ خیال جو شواہد وقرائن سے چنداں عاری بھی نہیں کہ تقسیم ملک کے بعد سے ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت مسلم اقلیت کو مسلسل مبتلائے کرب واضطراب کیا جارہا ہے۔ عنوانات جداگانہ، نام الگ الگ، بینر مختلف، انداز وطریقۂ کار متفاوت۔ کبھی فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکائی گئی، کبھی بابری مسجد کا تنازعہ کھڑا ہوا، کبھی سیمی کے نام سے گرفتاریاں، گاہے حزب المجاہدین سے وابستگی تو گاہے انڈین مجاہدین کے سیل سے تعلق۔ آسودگی نہ ہوئی تو القاعدہ، جیش محمد، داعش اور جانے کیسی کیسی ملکی وغیر ملکی تنظیموں سے روابط وارتباط کے تانے بانے، سینکڑوں مسلم نوجوان، اکثریت اعلیٰ عصری تعلیم یافتہ، علماء واساتذۂ مدارس جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی کے گراں بہا سال وماہ جانے کن حالات میں گزار رہے ہیں۔ برسہا برس تک نہ ان گرفتار شدگان کے لئے حمایت کا کوئی لفظ، نہ ہمدردی کا کوئی بول۔ مقدمات کی پیروی تو دور کی بات۔ گزشتہ چند سالوں سے حالات اس معنی کر قدرے اطمینان بخش کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے جانشین حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہٗ کی ایماء پر جمعیۃ نے ایسے ملزمان کے کیس لڑنے کا فیصلہ کیا۔ تادم تحریر سینکڑوں باعزت بری، سینکڑوں کو حمایت ملی، سزاؤں میں تخفیف، لیکن لگتا ہے کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کی یہ شب تاریک ابھی دور ہے، سحر ہے کہ طلوع ہونے کو نہیں آرہی ہے۔ غیروں سے تو شکوہ کیا جب اپنے ہی آگ کی لوتیز اور چنگاری کو شعلہ بداماں کرنے کا سامان فراہم کررہے ہیں۔ ۸/فروری کو دہلی میں ''تنظیم علماء اسلام'' کے زیر اہتمام جو کل ہند صوفیاء ومشائخ کانفرنس منعقد ہوئی اس میں گرج گرج کر کی جانے والی تقریروں کے اقتباسات ہر مسلمان کے لئے سوہانِ روح، جاری کردہ اعلامیہ ایسا کہ ہر پڑھنے والا حیران وششدر۔ فرقہ پرستوں نے بھی جو نہ سوچا اور کیا ہوگا وہ سب کچھ صدر مشائخ کے اسٹیج سے کیا اور بتایا گیا۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے؟ اردو شاعر نے شاید ایسی صورت حال کے لئے کہا تھا:

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں دام کا
طائروں پہ سحر ہے صیاد کے اقبال کا

فیا للأسف

✦.....✦.....✦

حیدرآباد یونیورسٹی کے دلت طالب علم روہت ویمولا کی دردناک خودکشی اربابِ بسط وکشا کی نیند اڑانے کے لئے کافی تھا، مگر افسوس بہت ہوا، جب مرکزی حکومت کے وزراء اور پارٹی لیڈران نے الٹے روہت کو ہی مورد الزام قرار دیدیا، کیسی معذرت، کہاں کی ندامت، اظہارتأسف کس چڑیا کا نام؟ اہل خانہ سے ہمدردی کا کیا سوال؟ دوسری اپوزیشن جماعتوں کے جن سربراہان نے ہمدردی اور خبر گیری کی، ان ہی کو کٹگھرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی، ان کے خلاف مردہ باد کے نعروں کی گونج، احتجاج اور مظاہرے، یہ ساری حرکت حکمراں جماعت، اس کی ذیلی جماعتوں اور طلبہ کی تنظیموں کے کارکنان کی طرف سے کی گئی۔

اس سے کہیں زیادہ افسوس ناک صورتِ حال جواہر لعل نہرو یونیورسٹی [جے۔این۔یو] میں پیش آئی۔ افضل گرو کی پھانسی کے خلاف احتجاجی جلوس کے دوران مشتعل اور پرجوش طلبہ بھیڑ کے درمیان سے، افضل کی حمایت پھانسی دیئے جانے کی مخالفت اور بہ قول مرکزی حکومت پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اپنے طور پر اس کا نوٹس لیا۔ تحقیقات کا آغاز بھی کر دیا گیا، یہ تفتیشی عمل ابھی جاری ہے، اس درمیان یونیورسٹی کمپلیکس میں دہلی پولیس داخل ہوگئی اور طلبہ یونین سربراہان سمیت بعض دوسرے لوگوں کو حراست میں لے لیا، اس گرفتاری نے جلی پر تیل کا کام کیا۔ یونیورسٹی کے طلبہ واساتذہ اس کے خلاف سراپا احتجاج، مرکزی حکومت کا رویہ دن بہ دن سخت سے سخت تر، اسی اثناء میں مرکزی وزیر داخلہ پریس کانفرنس میں یہ بیان کہ یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا، اس کی پشت پناہی لشکر طیبہ کے سربراہ حافظ سعید کر رہے ہیں۔

اگر خدانخواستہ ایسا ہے تو وزیر داخلہ صاحب کو پارلیمنٹ اور عوام کے سامنے اس کا دستاویزی ثبوت لانا چاہئے اور اس کی غیر جانب دار کل جماعتی پارلیمانی کمیٹی سے تحقیقات کرانی چاہئے۔ بہ صورت دیگر یہ ایک نہایت سنگین اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہوگی اور کسی منظّم سازش کا حصہ سمجھی جائے گی۔

✦.....✦.....✦

کشمیر کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید صاحب کی رحلت کے بعد سے تاہنوز نئی ریاستی حکومت کی تشکیل کا معاملہ حل نہیں ہوسکا ہے۔ مفتی صاحب نے بی جے پی کے ساتھ مل کر جو حکومت بنائی اور جن شرائط پر اتحاد کیا ان سے وادی

کی اکثریت خوش نہ تھی، اس کا احساس محبوبہ مفتی سمیت پارٹی کے لیڈروں کو ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محبوبہ مفتی، سابقہ معاہدوں کے تحت بی جے پی کے ساتھ اتحادی حکومت بنانے پر آمادہ نہیں۔ حلیف جماعت کا اصرار کہ حکومت سازی کے لئے نئے سرے سے معاہدہ نہیں ہوگا، لیکن بی جے پی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ریاستی اقتدار میں تاریخ میں پہلی مرتبہ شراکت داری سے کسی بھی صورت دست برداری گوارہ نہیں کرسکتی۔ محبوبہ مفتی، حلیف جماعت کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور حالات بتاتے ہیں کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہوجائے گی۔ ویسے محبوبہ مفتی نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ چنداں غیر معقول بھی نہیں۔ سرِ دست ریاست میں صدر راج نافذ ہے اور دیکھئے کہ جمہوری سیاسی عمل کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟

✦.....✦.....✦

صریر خامہ تحریر کیا جارہا تھا کہ یہ اطلاع آئی حرف بہ حرف درست کہ جمعیۃ علماء م کی ''حصولِ انصاف کانفرنس'' منعقدہ فیض عام انٹر کالج، میرٹھ مورخہ ۱۴ر فروری میں جمعیۃ کے دوسرے گروپ کے سربراہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب نہ صرف شریک ہوئے بلکہ بڑی سلجھی ہوئی تقریر بھی کی۔ خدا کرے اسٹیج کی یہ یک جاتی دونوں دھڑوں کی اتحاد میں تبدیل ہوجائے۔ دارالعلوم دیوبند کی تقسیم کا المیہ ملت اسلامیہ کے لئے سنگین زخم تھا، جو تاہنوز پوری طرح سے مندمل نہ ہوسکا۔ مسلمانوں کی بدنصیبی کہ ان کے کان صرف انتشار، نزاع، اختلاف اور گروہ بندی ہی کی باتیں سن پاتے ہیں۔ اتحاد، ہم آہنگی، مفاہمت اور شیرازہ بندی سننے کو ترس رہے ہیں۔ ایسے میں یہ لمحاتی مفہامت کچھ کم خوش آئند نہیں ہے۔

✦.....✦.....✦

مشکلات القرآن

❖ **تصنیف** : امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
ترجمہ : محترم مولانا محمد مزمل بدایونی / استاذ دار العلوم دیوبند

قرآن کریم کے ہر پہلو اور ہر گوشے پر ماشاء اللہ خوب کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے، البتہ مشکلاتِ قرآنی ایک ایسا موضوع ہے، جس پر عربی میں بھی کام کی مقدار بہت کم ہے اور اردو میں تو تقریباً ناپید ہے۔ امام العصر حضرت علامہ سید محمد شاہ کشمیری علیہ الرحمہ نے عدیم الفرصتی کے باوصف اب سے کئی سال پیش تر ایک وقیع کتاب بنام ''مشکلات القرآن'' تصنیف فرمائی تھی، جو اپنے موضوع پر سند کا درجہ رکھتی ہے، لیکن اختصار اور عربی میں ہونے کے باعث اس سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کیا جاسکا، ضرورت تھی کہ اس کا اردو ترجمہ ہو اور قدرے تسہیل بھی، خدا کا فضل ہے کہ دار العلوم دیوبند کے مقبول اور نمایاں استاذ فاضل گرامی مولانا محمد مزمل صاحب بدایونی زید مجدہٗ نے یہ کام شروع کر دیا ہے، جس کی پہلی قسط ہدیۂ قارئین ہے، کام خاصا دقیق ہے اور طویل بھی، دعا فرمائیں کہ یہ سلسلہ بعافیت پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اہل علم کے لئے سرمۂ بصیرت ثابت ہو۔

واضح رہے کہ ترجمے کے وقت کتاب ''مشکلات القرآن'' کی عبارات کو حوض (بوکس) میں کر دیا گیا ہے اور اس کے حوالہ جات کو حسبِ سابق حاشیے میں، علاوہ ازیں جا بجا مترجم موصوف نے بھی اپنے بیش قیمت حواشی تحریر فرمائے ہیں، جس سے بلاشبہ کتاب کی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔ **فجزاہ اللہ احسن الجزاء**. (ادارہ)

زیر نظر کتاب مخدوم و مربی محدّثِ وقت امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے گراں قدر مسودات کا مجموعہ ہے، جو احقر نے ترتیب دیا ہے اور حتی الوسع کتابوں کے حوالے بھی جمع کر دیئے ہیں۔ مسودات کی ترتیب و تہذیب اور حوالہ جات کی تخریج و تحقیق میں احقر کا جو طریقۂ کار رہا ہے اس کی تفصیل کتاب کے مقدمے میں موجود ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت کی عبارتیں بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدیلی کے متن میں دی گئی ہیں اور حوالہ جات کی عبارتیں حاشیے میں۔ بلاشبہ اللہ ہی توفیق دینے والا اور آسانی پیدا کرنے والا ہے اور اسی پر بھروسہ ہے۔

احقر محمد احمد رضا بجنوری عفا اللہ عنہ
ناظم مجلس علمی، ڈابھیل

حضرت امامؒ نے فرمایا:

۱-اللہ تعالیٰ کا ارشاد "صراط الذین انعمت علیھم"، "فبھداھم اقتدہ" (والی آیت پیش نظر رکھ کر سمجھیں) (الیواقیت)

۱-اگر آپ یہ معلوم کریں کہ آپ ﷺ سابق انبیاء کرام کے محمود تھے، اس پر قرآن کریم سے کیا دلیل ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ اس کی دلیل فرمانِ باری تعالیٰ "اولٰئك الذین ھَدی اللّٰہ فبھداھم اقتدہ" ہے (یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے سو تو چل ان کے طریقے پر) یعنی ان کا طریقہ (دراصل) آپ کا ہی وہ طریقہ ہے جو باطنی طور پر آپ سے ان کی جانب سرایت کیا ہوا ہے۔ اس لئے جب آپ ان کے طریقے کو اختیار کریں گے (تو کوئی آپ کی شان میں نقص کی چیز نہیں؛ کیوں کہ) یہ ان کا آپ کے ہی طریق کو اختیار کرنا ہے، اس لئے کہ باطنی طور پر آپ کو اولیت اور ظاہراً آپ کو اخرویت حاصل ہے اور اگر "ہداہم" سے مراد اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا جو ہم نے لکھا ہے تو اللہ تعالیٰ "فبھم اقتدہ" فرماتے اور حدیث شریف: کنت نبیا و آدم علیہ السلام بین الماء والطین (میں نبی اسی وقت ہو چکا تھا جب آدم علیہ السلام پانی اور گارے کے درمیان ہی تھے) پہلے آ چکی ہے۔ لہٰذا ہر وہ نبی جو آپ کے وقتِ ظہور سے پہلے آیا ہے وہ اس شریعت کے لانے میں آپ کا ہی نائب ہے اور اس کی تائید حضور ﷺ کی ایک حدیث میں اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میری دونوں چھاتیوں کے درمیان رکھا، یعنی جیسا کہ جناب باری تعالیٰ کے شایانِ شان تھا۔ تو مجھے اولین و آخرین کا علم حاصل ہو گیا کیوں کہ اولین سے مراد وہی انبیاء کرام ہیں جو آپ کے جسد شریف کے پس پردہ ہونے کے وقت ظہور میں آپ سے پہلے ہیں۔ (الیواقیت ۱۸/۲)

۲-قولہ تعالیٰ "ھدی للمتقین" اس آیت کے ذیل میں تقویٰ کے وہ مراتب (ملحوظ رہیں) جو ایمان سے موخر ہیں، امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے بعد۔

۲-چناں چہ تقویٰ کے دیگر مراتب ایمان سے مؤخر ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ "تقویٰ" عرف شرع میں مختلف معنی میں آتا ہے، کبھی ایمان کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ آیت "و اَلزمھم کلمة التقوٰی" میں (اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا) اور کبھی توبہ کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ "ولو أن اھل القریٰ آمنوا واتقوا" میں (اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے) کبھی طاعت کے معنی میں جیسا کہ آیت کریمہ "أن أنذروا أنهٗ لا الٰه الا أنا فاتقون" میں (یہ کہ خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، سو مجھ سے ڈرتے رہو)، کبھی ترک گناہ کے معنی میں جیسا کہ "وأتوا البیوت من أبوابھا واتقوا اللّٰہ" والی آیت میں (اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو) اور کبھی اخلاص کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ "فإنھا من تقوی القلوب" میں (تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے)

۳-اللہ تعالیٰ کا ارشاد "أو کصیّب من السماء" (اس آیت میں "من السماء" کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ "صیّب" اپنے معنی حقیقی بارش کے معنی میں لیا جائے اور کوئی اس لفظ کو معنی مجازی (نفع کثیر) پر محمول نہ کرلے) جیسا کہ "و اذا استیقظ احدکم من منامه" میں محدثین نے فرمایا ہے کہ "من منامه" کا لفظ زائد لانے کا مقصد اس وہم کو دور کرنا ہے کہ کوئی "استیقاظ" کو (خواب طبعی نیند کے بجائے) خواب غفلت سے بیدار ہونے پر محمول نہ کرلے (یہ تاویل) شریک بن ابی نمر کی حدیث میں بھی کام آئے گی اور اسی طرح آیت کریمہ "من کان عدواً لجبریل فإنه نزلهٗ علٰی قلبك بإذن اللّٰه" (جو شخص بھی جبرئیل سے عداوت رکھے سو انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے) میں (یہ تاویل کام آئے گی کہ "باذن اللہ" کا اضافہ اس وہم کو دور کرنے کے لئے ہے کہ یہ قرآن کریم خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کلام نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے وہ تو سفیر محض ہیں) یہ آیت آں حضرت ﷺ کی نیند کی کیفیت (وغیرہ) کے سلسلے میں عبداللہ بن صوریا کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔

۳-اس آیت کا شانِ نزول تفسیر ابن جریر ابن ابی حاتم اور دیگر کتب حدیث مثلاً بیہقی، طبرانی، مسند امام احمد اور مسند عبد بن حمید میں اس طرح مروی ہے کہ جب آں حضرت ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کی ایک بڑی جماعت تفتیش حال کے لئے ان کے پاس آئی، ان کا سردار عبداللہ بن صوریا جو کہ علمائے فدک میں سے تھا، امتحان کے طور پر سوال کرنے لگا کہ پہلے ہم کو اپنے سونے کی کیفیت کے بارے میں بتائیں کیوں کہ پیغمبر آخر الزماں کے سونے کی کیفیت کے بارے میں ہماری کتابوں میں ایک علامت آئی ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ علامت آپ کے اندر موجود ہے یا نہیں؟ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا اور غافل نہیں ہوتا۔ اگر یہی علامت ہے تو میرے اندر موجود ہے۔ عبداللہ بن صوریا نے کہا آپ نے صحیح فرمایا، یہی علامت ہے۔ اب ہم آپ سے چند چیزوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ ان چیزوں کو پیغمبروں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: کہ جو چاہو پوچھو لیکن میں تم سے خدا کی قسم لیتا ہوں اور وہ عہد لیتا ہوں جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں سے لیا تھا، وہ یہ کہ اگر میں تمہیں ان چیزوں کے بارے میں بتادوں تو تم ایمان لے آؤ گے اور میری اطاعت کرلو گے؟ سب نے کہا کہ قبول ہے الخ۔ (فتح العزیز، ص:۳۴۹) (انہیں سوالوں میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے پاس یہ کلام (قرآن کریم) کون لاتا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ جبرئیل علیہ السلام! اس پر ان یہود نے کہا کہ وہ تو ہم سے پرانی دشمنی رکھتے ہیں، ہمارے ساتھ جو بڑے حادثات ہوئے ہیں وہ انہیں کے ہاتھوں انجام پائے ہیں۔ ہاں حضرت میکائیل علیہ السلام اچھے ہیں، وہ بارش اور خوش حالی کا نظم کرتے ہیں، اگر وہ لاتے تو ہم قبول کرلیتے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ محمد مزمل

۴-ارشاد باری تعالیٰ "قالوا هٰذا الذی رزقنا من قبل" (ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر) اس لئے کہ جزا در حقیقت دوسرے لباس میں مجزی علیہ کا ظہور ہے۔

۴-حضرت کشمیری علیہ الرحمہ نے اس آیت کریمہ میں بس اتنا ہی اشارہ کیا ہے جس کا ترجمہ اوپر کیا گیا، لیکن یہ حضرت کی انتہائی مختصر عبارت کچھ وضاحت کی متقاضی ہے۔ حضرت الامام نے فارسی کا یہ جملہ جس کا ترجمہ کیا گیا تفسیر فتح العزیز سے لیا ہے۔ راقم نے تفسیر فتح العزیز کی مکمل عبارت سے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اہل جنت یہ جو کہیں گے کہ "یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر" تو اس میں پیشتر سے مراد پھل نہیں ہیں بلکہ وہ طاعات و عبادات ہیں جو وہ دنیا میں انجام دیتے تھے اور ان میں وہ عجیب وغریب لذت محسوس کرتے تھے، جو ہر کس و ناکس کو نہیں بلکہ اہل دل اور خواص ہی کو محسوس ہوتی ہے، پھر جب ان کو ان عبادات کی جزا جنت میں دی جائے گی تو چوں کہ جزا در حقیقت مجزی علیہ کا ہی دوسرے لباس میں ظہور ہوتا ہے تو اس جزا میں بھی مجزی علیہ (طاعات) جیسی ہی لذت محسوس کریں گے اور پھر وہ بات کہیں گے جو آیت میں مذکور ہے۔ آیت کریمہ کا یہی محمل حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے بھی مسائل السلوک میں بیان کیا ہے۔ محمد مزمل

۵-اللہ تعالیٰ کا ارشاد "الذین ینقضون عهد اللّٰه من بعد میثاقه" (جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد) ابتداء سورت سے انتہائی لطیف اور مختصر پیرائے میں اس حقیقتِ ایمان کا بیان تھا اور اس آیت کے ذیل میں اس بات کا بیان ہے کہ اسلام، خدا کے ساتھ معاہدہ ہونے کا نام ہے۔

۵-الف: ایمان شرعی اصطلاح میں تصدیق کا نام ہے، یعنی ان تمام چیزوں کو مان لینا اور یقین کر لینا جن کا دین محمد (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں سے ہونا یقینی طور پر معلوم ہو جائے اس لئے کہ ایمان کو قرآن کریم میں جگہ جگہ دل کا عمل فرمایا گیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "وقلبهٗ مطمئن بالایمان" (بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ نحل:۱۰۶) دوسری جگہ فرماتے ہیں "کتب فی قلوبهم الایمان" (ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔ مجادلہ:۲۲) ایک اور جگہ پر ہے "ولما یدخل الایمان فی قلوبکم" (اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ الحجرات:۱۴) اور ظاہر ہے دل کا عمل یہی تصدیق ہے اور کچھ نہیں۔ نیز ایمان کو عمل صالح کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے جیسا کہ آیت کریمہ "إن الذین آمنوا و عملو الصٰلحٰت" میں (بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے۔ البروج:۱۱) اور معاصی کے ساتھ بھی (ایمان کو) بیان کیا گیا ہے جیسا کہ "و ان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا" والی آیت میں (اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں۔ الحجرات:۹) اور آیت کریمہ "والذین آمنوا ولم یهاجروا" میں بھی (اور جو لوگ ایمان تو لائے اور ہجرت نہیں کی۔ الانفال:۷۲) اس سے معلوم ہوا کہ نہ نیک اعمال کا ایمان میں دخل

ہے اور نہ اعمال بد ایمان کو خراب کرتے ہیں اور بے تصدیق کے صرف اقرار ہو تو اس کی اسی سورہ (بقرہ) میں آیت کریمہ "و من الناس من یقول آمنا باللّٰہ و بالیوم الآخر و ماھم بمؤمنین" میں مذمت کی گئی ہے (اور لوگوں میں بعضے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالاں کہ وہ بالکل ایمان والے نہیں۔ البقرۃ:۸) لہٰذا معلوم ہوا کہ اقرار محض، ایمان کی حکایت ہے۔ اگر وہ حکایت محکی عنہ کے مطابق ہے تو بہت خوب! ورنہ دھوکے اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں! اور محکی عنہ وہی تصدیق قلبی ہے۔

اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح ہر چیز کے تین قسم کے وجود ہوتے ہیں: وجودِ عینی، وجودِ ذہنی اور وجودِ لفظی، اسی طرح ایمان بھی ان تین وجود کے ساتھ متحقق ہے اور یہ قاعدہ ثابت شدہ ہے کہ ہر چیز کا وجود عینی اصل ہوتا ہے اور باقی دونوں وجود اس وجود کی فرع اور تابع ہوتے ہیں، پھر ایمان کا وجود عینی وہ نور ہے جو بندے اور ذات حق (جل مجدہ) کے درمیان پردہ اٹھ جانے سے دل میں حاصل ہوتا ہے اور یہی نور ہے جو آیت کریمہ "مثل نورہٖ کمشکوۃ فیھا مصباح" میں مکمل واضح تمثیل میں ذکر کیا گیا ہے (اس کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے۔ النور:۳۵) اور آیت کریمہ "اللّٰہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور" میں اس کا سبب بیان کیا گیا ہے (اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور کی طرف لاتا ہے۔ البقرہ:۲۵۷) اور یہ نور محسوس انوار کی طرح قوت وضعف اور شدت ونقص کو قبول کرتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ "و إذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا" میں مذکور ہے (اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ تازہ کر دیتی ہیں۔ الانفال:۲) اور اسی مضمون کی دوسری بہت سی آیتیں ذکر کی گئی ہیں۔

ایمان کی زیادتی کا طریقہ یہ ہے کہ جس قدر وہ حجاب اٹھے گا اسی قدر وہ نور زیادتی قبول کرے گا اور ایمان قوی ہوگا یہاں تک کہ وہ اپنے اوجِ کمال کو پہنچ جائے گا اور وہ نور وسیع اور کشادہ ہو کر تمام اعضاء وقوی کا احاطہ کر لیتا ہے تو سب سے پہلے شرح صدر حاصل ہوتا ہے، حقائق اشیاء سے واقف ہو جاتا ہے، غیوب (بعض پوشیدہ امور) اس کی قوت مدرکہ پر واشگاف ہو جاتے ہیں، ہر چیز کو اس کے مقام کے مطابق پہچانتا ہے اور انبیاء کرام نے جو بھی اجمالی وتفصیلی خبریں دی ہیں ان میں انبیاء کا صدق اس کے لئے ایک وجدانی چیز بن جاتا ہے، پھر اپنے نور اور شرح صدر کے بقدر اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر امر خداوندی کو اس کی مرضی کے مطابق بجالائے اور ہر ممنوع شرعی سے اجتناب کرے اور اس حالت میں اخلاق فاضلہ، کیفیاتِ حمیدہ اور اعمالِ صالحہ متبرکہ کے انوار، انوارِ معرفت کے ساتھ مل کر اور متحد ہو کر ایک عجیب سا چراغ بن کر حیوانی اور شہوت پسند طبیعت کے تاریک چمن کو روشن کر دیتے ہیں جیسا کہ اس مضمون کی جانب بہت سی آیاتِ قرآنیہ میں اشارہ ہوا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "نورھم یسعٰی بین أیدیھم و بأیمانھم" (ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑتا ہوگا: التحریم:۸)

اور ایک جگہ فرمایا گیا ہے: "نور علی نور یهد الله لنوره من يشاء" (نور علیٰ نور ہے اللہ تعالیٰ نور تک جس کو چاہتا ہے، راہ دیدیتا ہے۔ النور:۳۵)

اور ایمان کے وجود ذہنی کے دو مرتبے ہیں: پہلا مرتبہ ان روشن معارف اور منکشف ہونے والے غیوب کا مکمل طور پر بیک مرتبہ اجمالاً ملاحظہ کرنا جو کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا حاصل ہیں اور اس ملاحظہ کا نام تصدیق اجمالی، ماننا اور باور کرنا ہے۔ دوسرا مرتبہ تجلّی پذیر مغیبات اور منکشف ہونے والی حقیقتوں کے افراد میں سے ہر ہر فرد کا ان کے باہمی ربط کا لحاظ کرتے ہوئے تفصیلی طور پر ملاحظہ کرنا اور اس ملاحظے کا نام (علماء کرام) تصدیق تفصیلی رکھتے ہیں۔

اور ایمان کا وجود لفظی شارع کی اصطلاح میں صرف شہادتین کا نام ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ کسی چیز کا وجود لفظی اس چیز کی حقیقت متحقق ہوئے بغیر بالکل فائدہ نہیں دیتا، ورنہ تو پیاسا پانی کا نام لینے سے ہی سیراب ہوجاتا اور بھوکا روٹی کا نام لیتے ہی تسلی حاصل کر لیتا، لیکن بات یہ ہے کہ عالم بشریت میں مافی الضمیر کی ادائیگی نطق وتلفظ کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے لابدی طور پر کسی بھی شخص کے ایمان کا حکم لگانے میں کلمہ شہادت کے تلفظ کو بہت بڑا دخل ہے۔ فرماتے ہے: "امرت أن اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فإذا قالوها عصموا منى دمائهم و اموالهم إلا بحقها و حسابهم على الله" (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں اور جب وہ یہ کہہ دیں تو انہوں نے میری جانب سے اپنے خون اور مال محفوظ کر لئے، سوائے ان (خون و مال) کے حق کے اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے) اور اس تحقیق سے ایمان کی کمی وزیادتی اور اس کے قوت وضعف کی کیفیت بھی معلوم ہوگئی اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ وہ جو حدیث صحیح میں آیا ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے تو مومن ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا" اور "حیا ایمان کا شعبہ ہے" اور "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہوجائے" سب ایمان کے وجود عینی کے اعتبار سے کمالِ ایمان پر محمول ہیں اور جن حضرات نے ایمان کی کمی، زیادتی کی نفی کی ہے ان کی مراد وجود ذہنی کا مرتبہ اول (ملاحظہ اجمالی) ہے، اس لئے کوئی نزاع واختلاف نہیں ہے۔

پھر ایمان کی دو قسمیں ہیں: اول ایمان تقلیدی، دوم ایمان تحقیقی۔ پھر ایمان تحقیقی کی دو قسمیں ہیں: استدلالی اور کشفی۔ پھر ان دونوں میں سے ہر ایک یا تو اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا کہ اس سے آگے تجاوز نہ ہوسکے یا انتہائی کمال کو نہیں پہنچے گا اور جو اپنی انتہاء کو پہنچ جائے گا اس کو علم الیقین کہیں گے اور جو انتہاء کو نہیں پہنچتا اس کی بھی دو قسمیں ہیں: یا تو مشاہدے سے ہوگا جو عین الیقین کا مصداق ہے یا حضور ذاتی ہوگا جو حق الیقین کا مصداق ہے اور یہ اخیر کی دو قسمیں یعنی عین الیقین اور حق الیقین ایمان بالغیب سے متعلق نہیں ہوتی ہیں۔ (فتح العزیز: ۸۷-۸۸)

۵-ب: "الذين ينقضون عهد الله من بعد ميثاقه" (جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد۔ البقرہ: ۲۷) اس جگہ یہ جاننا چاہئے کہ جب ایک شخص کلمہ اسلام

زبان پر لے آیا، پیغمبر یا اس کے کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، رسول کو قاصد اور نائب خدا تصور کر لیا تو خدا کے ساتھ عہد ہو گیا کہ اس کا جو بھی حکم اس پیغمبر کے واسطے سے اس تک پہنچے گا وہ اس کو قبول کرے گا اور جب رسول کی صحبت سے شرف یاب ہو گیا یا نبی کی سیرت و عادات پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ کر لیا اور نبی کے اس اخلاق و کردار سے واقف ہو گیا جو سراپا ان کی حقانیت کی دلیل ہیں یا نبی کے معجزات اور اولیاء امت کی کرامات کا مشاہدہ کر لیا یا سن لیا تو اس نے اس عہد کو پختہ کر لیا، اب اس حالت کے بعد معاذ اللہ اگر اسلام کے معاملے میں اس کے دل میں کوئی شبہ جگہ پکڑ گیا اور اس شبہ کی وجہ سے وہ شرعی احکام میں طعن و تشنیع کرنے لگا تو یقینی بات ہے کہ وہ حد عقل و شرع سے خارج ہو گیا اور گمراہی کے اعلیٰ مرتبہ پر ترقی کر گیا، جو اسلام میں داخل ہونے، رسول اور اس کے معجزات کو دیکھنے یا رسول کے اخلاق و کردار کو سننے سے پہلے اس کو حاصل نہ تھا، لہٰذا یہ اس بات کی واضح علامت ہے کہ یہ شخص سرکش، کفر کی ادنیٰ حد سے خارج اور کفر کے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوا ہے۔ (فتح العزیز: ۱۴۳)

✦.....❖.....✦

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات
اسلامی شریعت کی روشنی میں

❖ مولانا محمد یحییٰ نعمانی / لکھنؤ

موجودہ زمانے میں اس سلسلے میں بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مسلم دشمن پروپیگنڈہ مشنریز نے بڑا شور مچایا ہے کہ اسلام نفرت و دشمنی کی تبلیغ کرنے والا دین ہے۔ اس کی کتاب قرآن امن عالم کے لئے خطرہ ہے۔ جب تک وہ دنیا میں موجود رہے گا، دنیا امن سے محروم رہے گی۔ انہوں نے اپنے اس پروپیگنڈے کی ترویج کے لئے قرآن کی بعض آیات کو غلط مفہوم پہنا کر پیش کیا ہے اور حقیقت حال سے ناواقف لوگوں کے لئے تلبیس کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ کتابوں اور اخبارات و رسائل کے علاوہ انٹرنیٹ پر تو اس پروپیگنڈے کا ایک تلاطم خیز سمندر ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ اعتراف ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک تعداد کے اندر اس سلسلے میں ایسی غلط فہمیاں اور غلو آمیز تصورات پائے جاتے ہیں، جن کی بنیاد قرآن و سنت کے نصوص کی سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے پر مکمل اور واضح گفتگو کی جائے، تلبیسات کا پردہ چاک اور غلط فہمیوں اور غلو آمیز نظریات کی بنیاد شکنی کی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی یہ تاکید ہے کہ مسلمان اپنے دینی مزاج و خصوصیات اور اخلاقی صفات میں غیر مسلموں سے کھلے طور پر ممتاز رہیں، ان کی نقالی سے پرہیز کریں اور خاص طور پر ان کی ان مذہبی نشانیوں اور رسموں سے (جن کو اسلام غلط کہتا ہے) علیحدگی کا ضرور اظہار کریں۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن نے اسلام کے دشمنوں اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے والوں سے ساز باز کرنے سے سختی سے منع کیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ رحم دلی، ہمدردی، حسنِ سلوک، نرمی اور اچھوں سے محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ تفصیل ذیل میں ہے:

انسانی برادری کا احترام : اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے یہ تعلیم بھی ہے کہ سارے انسان چاہے وہ جس قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں وہ ایک ماں باپ کی اولاد اور ایک انسانی برادری کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ (سورۂ حجرات ۱۳)

اسلام نے ساری انسانیت کو ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کا جو تصور دیا ہے اور جس کو قرآن وحدیث میں بار بار یاد دلایا گیا ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ ایک وسیع تر انسانی برادری کا احساس اور سارے انسانوں کے بھائی بھائی ہونے کا شعور پیدا ہو۔

اسی لئے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نماز کے بعد دعا وحمد کے کلمات کے دوران اللہ کی ربوبیت اور اپنی رسالت کی گواہی کے ساتھ یہ شہادت بھی دیا کرتے تھے کہ **اللھم ربنا و رب کل شیء انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ.**

''اے اللہ! ہمارے اور ہر چیز کے رب، میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے بندے بھائی بھائی ہیں۔(ابوداؤد ۱۵۰۸، مسند احمد ۱۸۸۰۷، بسند ضعیف)

قرآن کی نظر میں نوع انسانی ایک قابل تکریم واحترام مخلوق ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ .....وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيرٍ ممن خلَقْنا تفضيلاً. (اسرا:۷۰)

اور ہم نے بنی آدمی کو تکریم سے نوازا اور ان کو اپنی بہت ساری مخلوقات پر فضیلت بخشی۔

اسلام انسان کو بنیادی طور پر اپنی انسانیت کی بنا پر قابل اکرام ومحبت اور ہمدردی کا مستحق بتاتا ہے۔ایک مرتبہ آں حضرت ﷺ کی مجلس میں کچھ صحابہ حاضر تھے کہ ایک جنازہ گزرا۔آپ کھڑے ہوگئے۔لوگوں نے (یہ دیکھ کہ آں حضرت ﷺ جنازے کے اکرام میں کھڑے ہوئے ہیں) آپ کو بتلایا کہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا یہ جان (یعنی انسان) نہیں؟ **الیت نفساً** آپؐ کے بعد کچھ صحابہ اس پر عمل بھی کیا کرتے تھے۔(ملاحظہ ہو صحیح بخاری ۱۳۱۳ وصحیح مسلم ۹۶۱)

رسول اللہ ﷺ نے ساری مخلوق کے ساتھ رحم دلی کی فاتح زمانہ تعلیم دی ہے۔ارشاد ہے: **الراحمون من یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء** (سنن ترمذی ۱۹۲۴، سنن ابی داؤد ۴۹۴۱)

رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے، تم زمین والوں کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کرو آسمان والا تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرے گا۔

یہ دراصل قرآن کی رحم کی عام تعلیم ہی کی تشریح ہے۔قرآن نے رحمت و ہمدردی کی پرجوش ترغیب دیتے ہوئے کہا ہے کہ افسوس انسان کو ساری نعمتیں بھی نجات کی گھاٹی پار کرنے پر آمادہ نہیں کرتیں۔پھر نجات کی گھاٹی پار کیسے ہوتی ہے؟ اس کی یہ تفصیل ارشاد ہوئی ہے:

''غلام آزاد کرنا، قحط کے دنوں میں کھانا کھلانا، یتیم رشتہ دار کو یا ایسے غریب کو جو غربت سے خاک میں ملا جارہا ہے، پھر اس کے بعد ان لوگوں میں سے ہونا جو ایمان لائے اور آپس میں ایک دوسرے کو تحمل و برداشت اور رحم کی تاکید کرتے رہے۔'' (سورۃ البلد ۱۱ تا ۱۷)

یہ ہے نجات کا راستہ، خود ہی صرف رحم دل نہ ہونا، بلکہ رحم دلی اور ترس کھانے کے تبلیغی مشن میں لگنا، ایسوں ہی کے قدم شاہراہ نجات پر ہیں۔

اسلام نے انسان کو ہر جاندار کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے۔

فی کل کبد رطبة اجر. (صحیح بخاری ۶۰۰۹)

ہر جاندار کے ساتھ حسنِ سلوک میں ثواب ہے۔

قومی اخوت کا رشتہ : اسلام ایک قوم ونسل کے لوگوں میں ایک طرح کی اخوت اور اس پر مبنی اپنائیت کے رشتے کو ایک ثابت شدہ قدر کہتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار قرآن نے جابجا اس طرح کیا ہے کہ حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کو اپنی مسلم قوموں کا بھائی قرار دیا ہے اور اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قومی اخوات کو تسلیم کیا ہے۔ **وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا. وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا . وَ اِلٰی مدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا.** (الاعراف)

یہ اللہ کے نبی جب اپنی دعوت لے کر ان قوموں کے پاس جاتے تھے تو ان کو 'یا قومی' اے میری قوم! اے میری قوم! کے دل نواز انداز میں مخاطب کرتے اور اسی قومی اخوت کی دہائیاں دیتے تھے۔ یہ آیات بڑی واضح رہنمائی دیتی ہیں کہ مسلمان اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کس قسم کی خیر خواہانہ محبت کا طرزِ خطاب اختیار کریں۔

اس زمانے میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی یہ اہم ترین بنیاد ہے۔ اسی کی بنا پر ایک ملک یا ایک معاشرتی اکائی میں بسنے والے مسلمانوں کے درمیان رشتے قائم ہونے چاہئیں۔

نسلی رشتے کی بنیاد پر پوری قوم کس طرح ہمدری اور محبت کی مستحق ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ کو صرف اس بنا پر مصریوں کا خیال تھا کہ حضرت اسماعیل کی والدہ اور وہاں کی تھیں، آپ عربوں کو اس قدیم نسلی رشتے کا خیال رکھنے کی وصیت کر گئے۔ آپ نے فرمایا: **انکم ستفتحون ارضا یذکر فیها القیراط فاستوصوا باهلا خیرا، فان لهم ذمة ور حما.** (صحیح مسلم ۲۵۵۳)

تم لوگ عنقریب مصر فتح کروگے، میری وصیت ہے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اس لئے کہ ان کو حق ذمہ ہوگا اور ان سے تمہارا نسلی رشتہ بھی ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردانہ معاملے کی کچھ مثالیں : بحیثیت انسان غیر مسلم ہمدردی وحسنِ سلوک کے مستحق ہیں، اس کی مثالیں مختلف اسلامی تعلیمات اور آں حضرت ﷺ کے طرزِ عمل کے آئینے میں ہم کو بکثرت ملتی ہیں۔

۱- مالی مدد : قرآن مجید میں ایک جگہ حکم دیا ہے کہ غیر مسلم ضرورت مند بھی تمہاری مالی مدد کا مستحق ہے۔ اس

کی مالی مدد کی جانی چاہئے۔ سورۂ بقرہ میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ کسی کو ہدایت دینا یا نہ دینا یہ تمہارا کام نہیں، اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تم اس خیال سے کسی کی مالی مدد سے ہاتھ نہ روکو کہ وہ اسلام قبول نہیں کرتا، تم اللہ کے راستے میں جو خرچ کرو گے اس کا بدلہ پاؤ گے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ.

اس آیت کا سیاق بتلاتا ہے کہ انسانوں کی مالی مدد کے وقت یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ کون اسلام کو قبول کرتا ہے کون نہیں؟ ہر ضرورت مند مستحق ہے۔

امام ابن جریر طبری اس آیت کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کو صدقے سے محروم نہ رکھا جائے۔ طبری نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ علماء، صحابہ، تابعین نے اس آیت سے یہی معنی اخذ کئے ہیں۔ (تفسیر طبری ۶۳/۳)

خلفائے راشدین کا یہی طرزِ عمل رہا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر کے نام خط لکھ کر حکم دیا کہ غیر مسلم رعایا میں جو غریب اور ضرورت مند ہو اس کی اور اس کے عیال کی کفالت مسلمانوں کے مال میں سے کی جائے۔ (کتاب الخراج، ابو یوسف، ص ۱۵۷)

۲- صلہ رحمی : اسلامی زندگی کی بنیاد جن چیزوں پر رکھی گئی ہے ان میں سے ایک رشتہ داروں (خصوصاً قریبی رشتہ داروں) کے ساتھ حسنِ سلوک بھی ہے جو 'صلہ رحمی' کہلاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ صاف اعلان کر دیا گیا ہے کہ جو رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ نہیں نبھاتا اللہ کا اس سے اعلانِ جنگ ہے۔ **ومن قطعها بتته** (مسند احمد ۱۶۸۴، نیز صحیح بخاری ۵۹۸۷-۵۹۸۹) اور صاف اعلان کر دیا گیا ہے کہ جنت میں رشتوں کو کاٹنے والے کی کوئی جگہ نہیں۔ (مسلم ۲۵۵۶)

حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہتیں اور وہ صبر کرتے تھے۔ انہوں نے آں حضرت ﷺ سے شکایت کی تو بجائے نفرت کے دعا ملی اور دعا سے ہدایت یاب ہوئیں۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے لئے مزید دعا کی کہ اے اللہ! ابو ہریرہؓ اور ان کی ماں کی محبت اپنے مومن بندوں کے دل میں ڈال دے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: بس! اب ہر ایمان والا مجھ سے محبت کرتا ہے۔ (صحیح مسلم ۲۴۹۱)

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ مشرک تھیں، صلح حدیبیہ کے بعد جب دونوں طرف کے رشتے داروں کو آپس میں ملنے کا موقع ملا تو وہ اپنی بیٹی حضرت اسماء کے پاس آئیں۔ ساتھ میں کچھ ہدیے، تحائف بھی تھے۔ حضرت اسماء کو بھی خیال ہوا کہ والدہ کو کچھ تحفوں کے ساتھ رخصت کیا جائے، مگر شبہ ہوا کہ اسلام کہیں غیر مسلم رشتہ

داروں کو تحفے دینے سے منع تو نہیں کرتا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرو اور ان کو تحائف کے ساتھ رخصت کرو۔ (صحیح بخاری ۲۶۰۲، نیز فتح الباری)

اس روایت کے الفاظ 'وهي راغبة' سے کچھ لوگوں نے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ وہ کسی طلب کے ارادہ سے مدینہ آئی تھیں اور ضرورت مند تھیں، لیکن وہ تو ایک خوشحال خاتون تھیں۔ حافظ ابن حجر نے دیگر مآخذ سے یہ تصریح بیان کی ہے کہ وہ تو خود ہدیے تحائف لائی تھیں۔ عربی زبان کی رو سے ان الفاظ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس رشتے کو بحال کرنا چاہتی تھیں، جس کو حالات کی ستم ظریفیوں نے کاٹ ڈالا تھا۔ لہٰذا حضرت اسماء کے ہدیے کا مقصد بظاہر ضرورت منداں کی مدد نہیں بلکہ خاندانی رشتہ محبت کے حق کی ادائیگی تھی۔

دیگر سماجی تعلقات :مسلمانوں کو اگرچہ غیر مسلموں کے ساتھ ایسے اختلاط سے منع کیا گیا ہے جس سے ان کی دینی خصوصیات کے مٹنے کا ڈر ہو لیکن اس کے باوجود اسلام غیر مسلموں کے ساتھ اعلیٰ درجے کی خیر خواہی اور بہتر معاشرت کی ہدایت کرتا ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اسلام کی ایسی تاکیدی تعلیم ہے کہ احادیث میں اس میں کوتاہی پر ایمان کے سلب کئے جانے کا خطرہ بتلایا گیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے سراپا رحمت ولطف ہونے کے باوجود تین تین مرتبہ قسمیں کھا کر کہا ہے کہ جو پڑوسی کے لئے بے اطمینانی کا سبب بنے وہ مومن نہیں۔ (صحیح بخاری ۶۰۱۶)

یہ پڑوس کا تعلق مسلم وغیر مسلم سب کا ہوسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے گھر ایک بکری ذبح کی گئی، گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے پوچھا: ہمارے یہودی پڑوسی کے گھر میں کچھ بھیجا؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید کرتے سنا ہے۔ (ابوداؤد، ص ۵۱۵۲)

مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی ایک حسین تعلیم یہ بھی ہے کہ دشمن بھی اگر کسی مصیبت میں ہو تو اس کے لئے اللہ سے نیک دعا کی جائے۔ اگر ایک طرف آپؐ اللہ سے کبھی ظلم واستبداد کے خوگروں کو سزا دینے کی دعا کرتے تھے۔ (بخاری ۳۸۵۴) تو دوسری طرف یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ مکہ کے لوگ جو ظلم ودشمنی میں ہر نا کردنی کرتے آرہے ہیں، شدید قحط میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اب ان کو محمدؐ یاد آتا ہے۔ ابوسفیان آتے ہیں اور رشتے داری کی دہائی دے کر کہتے ہیں کہ آپ کی قوم مری جارہی ہے، دعا کردیجئے۔ آپ ﷺ دعا فرماتے ہیں، بالآخر آپؐ کی دعا سے ہی یہ عذاب ٹلا۔ (صحیح بخاری ۴۸۲۴)

کسی یہودی کو آپ کی مجلس میں چھینک آئی تو آپؐ جس طرح مسلمانوں کو دعا دیتے اسی طرح ان کو بھی دیتے، **یهديكم الله و يصلح بالكم** (سنن ابوداؤد، ۵۰۴۰)

اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارا حال اچھا کرے۔ روایت میں ہے کہ اس دعا کے شوق میں یہود بن بن کر چھینکتے، مگر رسول اللہؐ انکو پھر بھی اس دعا سے نوازتے۔

مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق (اور بخاری میں بھی) غیر مسلم کو دعا دینے سے متعلق کئی روایات کو باقاعدہ ایک باب کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی کیسی خیر خواہی کی تعلیم دی ہے۔

پریشان و مصیبت زدہ سے اظہار ہمدردی، سماجی رشتوں کو تعمیر کرنے والی چیز ہے۔ آں حضرت ﷺ خود اس پر کاربند تھے۔ غیر مسلموں کی عیادت کرتے اور ان کے گھر جاتے تھے۔ (صحیح بخاری، ص ۵۶۶۷)

غیر مسلموں کو ہدیے اور تحفے دینا اور ان کے ہدیوں کو قدر کے ساتھ قبول کرنا بھی آپ ﷺ کی سنت تھی۔ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلے میں متعدد واقعات مروی ہیں۔ ایک غیر مسلم فرماں روا نے آپ ﷺ کے لئے ایک بڑا حسین ریشمی کام دار جبہ بھیجا، آپ نے قبول فرمایا۔ (صحیح بخاری، ص ۲۶۱۶)

حضرت جعفر بن ابی طالب کو یہ کہہ کر دیدیا کہ وہ اس کو اپنے بھائی نجاشی کے پاس بھیجیں۔ (مسند احمد ص ۱۳۲۱۴) حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو ایک قیمتی کپڑا ہدیے میں بھیجا جو رسول اللہؐ کے علم میں آیا۔ (مسلم ۲۰۶۸)

ایلہ کے بادشاہ نے آپ کو کپڑے اور سواری بھیجی جو استعمال کئے گئے۔ (صحیح بخاری ۳۱۶۱)

آپ ﷺ نے اپنی وفات کے وقت امت کو اور خصوصاً اپنے خلفاء کو جو وصیت فرمائی اس میں یہ ہدایت بھی تھی کہ آنے والے مہمان وفود کو (جو عموماً غیر مسلم ہوتے تھے) انعام دے کر رخصت کیا کرو جیسا کہ میرا معمول تھا۔ (صحیح بخاری ۳۰۵۳، نیز صحیح مسلم ۱۶۳۷)

ہم طعامی کا حسن تعلق میں خاص مقام ہے۔ آپؐ غیر مسلموں کو کھانے پر بھی مدعو کرتے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں آپ نے ۳۰/افراد کی دعوت کی تھی۔ (مسند احمد ۸۸۵)

شریعت وسنت کے ان نہایت مختصر حوالوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کی اصل ہدایت غیر مسلموں کے ساتھ عام انسانی محبت، ہمدردی اور ہر قسم کے حسن سلوک کی ہے۔ یعنی اگر غیر مسلم صرف غیر مسلم ہے، ظالم، اسلام کا دشمن، مسلمانوں سے جنگ آزما اور فسادی سازشوں کا مرتکب نہیں ہے تو اسلام اس کو انسانی برادری کے رشتے کے اکرام، مدد اور تعاون کا مستحق جانتا ہے۔

✦.....❖.....✦

ضعیف احادیث اوران کاحکم

❖ مولانا محمد نجیب قاسمی/ریاض

حدیث وہ کلام ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کے قول یا عمل یا کسی صحابی کے عمل پر آپؐ کے سکوت یا آپؐ کی صفات میں سے کسی صفت کا ذکر کیا گیا ہو۔صحابہ کرام وتابعین و تبع تابعین ومحدثین ومفسرین و وفقہاء وعلماء و مؤرخین غرضیکہ ابتداء اسلام سے عصر حاضر تک، امت مسلمہ کے تمام مکاتب فکر نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کے بعد حدیث، اسلامی قانون کا دوسرا اہم و بنیادی ماخذ ہے اور حدیث نبوی بھی قرآن کریم کی طرح شریعت اسلامیہ میں قطعی دلیل اور حجت ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور رسول کی اطاعت احادیث پر عمل کرنا ہی تو ہے۔غرضیکہ احکام قرآن پر عمل کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال یعنی حدیث نبوی کے مطابق زندگی گزارنا ضروری ہے۔حق تو یہ ہے کہ قرآن فہمی حدیث نبوی کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور اکرم ﷺ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ آپ امت مسلمہ کے سامنے قرآن کریم کے احکام ومسائل کھول کھول کر بیان کریں۔ نبی ورسول کی بعثت کا بنیادی مقصد احکامِ الٰہی کو اپنے قول وعمل کے ذریعے انسانوں کی رہنمائی کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔جس طرح ایمان کے معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں کی جاسکتی کہ ایک کو مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے۔ٹھیک اسی طرح کلام اللہ اور کلام رسول کے درمیان بھی کسی تفریق کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایک کو واجب الاطاعت مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے کیوں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے انکار پر دوسرے کا انکار خود بخود لازم آئے گا۔

حدیث ان میں سے کسی ایک مقصد کے لئے ہوتی ہے: (۱) قرآن کریم میں وارد عقائد واحکام ومسائل کی تاکید (۲) قرآن کریم میں وارد عقائد واحکام مسائل کے اجمال کی تفصیل (۳) قرآن کریم کے ابہام کی وضاحت (۴) قرآن کریم کے عموم کی تخصیص (۵) بعض دیگر عقائد واحکام ومسائل کا ذکر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر آیت نمبر ۷ میں ارشاد فرمادیا جس کا حکم نبی اکرمؐ دیں اس کو بجالاؤ اور جس کام سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

سند حدیث یعنی جن واسطوں سے نبی کریم ﷺ کا قول یا عمل یا تقریر یا آپ کی کوئی صفت امت تک پہنچی

ہے، کے اعتبار سے حدیث کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں، جن میں سے تین اہم اقسام حسب ذیل ہیں:

صحیح : وہ حدیث مرفوع جس کی سند میں ہر راوی علم وتقویٰ دونوں میں کمال کو پہنچا ہوا ور ہر راوی نے اپنے شیخ سے حدیث سنی ہو۔ نیز حدیث کے متن میں کسی دوسرے مضبوط راوی کی روایت سے کوئی تعارض بھی نہ ہو اور کوئی دوسرا نقص بھی نہ ہو۔

صحیح کا حکم : جمہور محدثین ومفسرین وفقہاء وعلماء کا ان احادیث سے عقائد واحکام ثابت کرنے میں اتفاق ہے۔

حسن : وہ حدیث مرفوع جس کی سند میں ہر راوی تقویٰ میں تو کمال کو پہنچا ہوا ہو اور ہر راوی نے اپنے شیخ سے حدیث بھی سنی ہو، نیز حدیث کے متن میں کسی دوسرے مضبوط راوی کی روایت سے کوئی تعارض بھی نہ ہو لیکن کوئی ایک راوی علم میں اعلیٰ پیمانہ کا نہ ہو۔

حسن کا حکم : جمہور محدثین ومفسرین وعلماء کا ان احادیث سے عقائد واحکام ثابت کرنے میں اتفاق ہے، البتہ اس کا درجہ صحیح سے کم ہے۔

ضعیف : حدیث حسن کی شرائط میں سے کوئی ایک شرط مفقود ہو۔

ضعیف کا حکم : احادیث ضعیفہ سے احکام وفضائل میں استدلال کے لئے فقہاء وعلماء محدثین کی تین رائیں ہیں: (۱) احادیث ضعیفہ سے احکام وفضائل دونوں میں استدلال کیا جاسکتا ہے (۲) احادیث ضعیفہ سے احکام وفضائل دونوں میں استدلال نہیں کیا جاسکتا (۳) عقائد یا احکام تو ثابت نہیں ہوتے، البتہ قرآن یا احادیث صحیحہ سے ثابت شدہ اعمال کی فضیلت کے لئے احادیث ضعیفہ قبول کی جاتی ہیں۔ جمہور محدثین ومفسرین وفقہاء و علماء کی یہی رائے ہے۔ مشہور محدث امام نوویؒ نے علماء امت کا اس پر اجماع ہونے کا ذکر کیا ہے۔

حدیث کی اصطلاح میں صحیح، غلط یا باطل کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوتا ہے، بلکہ صحیح کا مطلب ایسی حدیث جس کی سند میں ذرہ برابر کسی بھی نوعیت کی کوئی کمی نہ ہو اور تمام راوی علم وتقویٰ میں کمال کو پہنچے ہوئے ہوں جب کہ حدیث حسن کا مطلب ہے کہ جو صحیح کے مقابلے میں درجہ میں کچھ کم ہو، ضعیف کا مطلب یہ ہے کہ اس کی سند کے کسی راوی میں کچھ ضعف ہو جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ غرضیکہ ضعیف حدیث بھی صحیح حدیث کی ایک قسم ہے۔ ضعیف حدیث میں ضعف عموماً معمولی درجہ کا ہی ہوتا ہے۔ ذخیرہ حدیث میں اگرچہ کچھ موضوعات بھی شامل ہوگئی ہیں لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں، نیز محدثین وعلماء نے دن رات کی جدوجہد سے ان کی نشاندہی بھی کردی ہے۔

خیرالقرون سے آج تک اصطلاحِ حدیث میں صحیح کے مقابلے میں موضوع استعمال ہوتا ہے یعنی وہ من گھڑت بات جو حضور اکرم ﷺ کی طرف غلط منسوب کردی گئی ہو۔ گویا موضوع حدیث سرے سے حدیث ہی

نہیں ہے۔ جب کہ ضعیف حدیث صحیح حدیث کی ہی ایک قسم ہے لیکن اس کی سند میں کچھ کمزوری کی وجہ سے جمہور علماء اس کو فضائل کے باب میں قبول کرتے ہیں۔ مثلاً سند میں اگر کوئی راوی غیر معروف ثابت ہوا یعنی یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے یا اس نے کسی ایک موقع پر جھوٹ بولا ہے یا سند میں تلبیس ہے، تو اس نوعیت کے شک وشبہ کی وجہ سے محدثین وفقہاء وعلماء احتیاط کے طور پر اس راوی کی حدیث کو عقائد اور احکام میں قبول نہیں کرتے بلکہ جو عقائد یا احکام قرآن کریم یا صحیح احادیث سے ثابت ہوئے ہیں ان کے فضائل کے لئے قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم کے علاوہ حدیث کی مشہور ومعروف تمام ہی کتابوں میں ضعیف احادیث کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور امت مسلمہ ان کتابوں کو زمانۂ قدیم سے قبولیت کا شرف دیئے ہوئے ہے، حتی کہ بعض علماء کی تحقیق کے مطابق بخاری کی تعالیق اور مسلم کی شواہد میں بھی چند ضعیف احادیث موجود ہیں۔ امام بخاریؒ نے حدیث کی متعدد کتابیں تحریر فرمائیں۔ بخاری شریف کے علاوہ ان کی بھی تمام کتابوں میں ضعیف احادیث کثرت سے موجود ہیں۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم سے قبل اور بعد میں احادیث پر مشتمل کتابیں تحریر کی گئیں مگر ہر محدث نے اپنی کتاب میں ضعیف حدیثیں ذکر فرمائی ہیں۔ اسی طرح بعض محدثین نے صرف صحیح احادیث کو ذکر کرنے کا اپنے اوپر التزام کیا۔ مثلاً صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان وغیرہ مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی کتاب میں احادیث ضعیفہ بھی ذکر فرمائیں جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خیر القرون سے آج تک تمام محدثین نے احادیث ضعیفہ کو قبول کیا ہے۔ سب سے مشہور و معروف تفسیر قرآن تفسیر ابن کثیر میں اچھی خاصی تعداد میں ضعیف احادیث ہیں لیکن اس کے باوجود تقریباً ۷۰۰ سال سے پوری امت مسلمہ نے اس کو قبول کیا ہے اور وہ سب سے زیادہ پڑھی جانے والی تفسیر ہے اور اس کے بعد لکھی جانے والی تفسیروں کے لئے منبع وماخذ ہے۔

اگر ضعیف حدیث نا قابل اعتبار نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ محدثین نے اپنی کتابوں میں انہیں کیوں جمع کیا؟ اور ان کے لئے طویل سفر کیوں کئے؟ نیز یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اگر ضعیف حدیث نا قابل اعتبار نہیں سمجھا جائے گا تو سیرتِ نبوی اور تاریخ اسلام کا ایک بڑا حصہ دفن کرنا پڑے گا کیوں کہ سیرت اور تاریخ اسلام کا وافر حصہ ایسی روایات پر مبنی ہے جس کی سند میں ضعف ہے۔ زمانۂ قدیم سے جمہور محدثین کا اصول یہی ہے کہ ضعیف حدیث فضائل میں معتبر ہے اور انہوں نے ضعیف حدیث کو صحیح حدیث کی اقسام کے ضمن میں ہی شمار کیا ہے۔ مسلم شریف کی سب سے زیادہ مقبول شرح لکھنے والے امام نوویؒ فرماتے ہیں: محدثین، فقہاء اور جمہور علماء نے فرمایا ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا فضائل اور ترغیب وترہیب میں جائز اور مستحب ہے۔ (الاذکار، ص ۷-۸)

اسی اصول کو دیگر علماء ومحدثین نے تحریر فرمایا ہے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: شیخ ملا علی قاریؒ (موضوعات کبیرہ ص ۵، شرح العقاریہ ج ۱، ص ۹، فتح العنایہ ۱/۴۹) شیخ امام حاکم ابوعبداللہ نیشاپوریؒ (مستدرک

حاکم، ج۱،ص۴۹۰)، شیخ ابن حجر الہیثمیؒ (فتح المبین ص۳۲)، شیخ ابومحمد ابن قدامہؒ (المغنی ۱/۱۰۴۴)، شیخ علامہ الشوکانیؒ (نیل الاوطار ۳/۶۸)، شیخ حافظ ابن رجب حنبلیؒ (شرح علل الترمذی ۱/۷۲-۷۴)، شیخ علامہ ابن تیمیہ حنبلیؒ (فتاویٰ ج۱،ص۳۹)، شیخ نواب صدیق حسن خاں (دلیل الطالب علی المطالب، ص۸۸۹)

عصر حاضر میں بعض حضرات جو مسلمانوں کی آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہیں، اپنی رائے کو امت مسلمہ کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جو وہ کہتے ہیں وہی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نقطۂ نظر میں حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا معیار صرف یہ ہے کہ جو وہ کہیں وہ صرف صحیح ہے حالاں کہ احادیث کی کتابیں تحریر ہونے کے بعد حدیث بیان کرنے والے راویوں پر باقاعدہ بحث ہوئی، جس کو اسماء الرجال کی بحث کہا جاتا ہے۔ احکام شرعیہ میں علماء وفقہاء کے اختلاف کی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید اختلاف محدثین کا راویوں کو ضعیف اور ثقہ قرار دینے میں ہے یعنی ایک حدیث ایک محدث کے نقطہ نظر میں ضعیف اور دیگر محدثین کی رائے میں صحیح ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی حدیث پیش کی جائے تو فوراً عام لوگوں کو بغیر تحقیق کئے ہوئے یہ تبصرہ نہیں کرنا چاہئے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ بہت زیادہ ممکن ہے کہ وہ حدیث صحیح ہو، جس سے نبی اکرمؐ کے قول کا انکار لازم آئے اسی طرح اگر کوئی عالم کسی حدیث کو قابل عمل نہیں سمجھتا ہے تو وہ اس پر عمل نہ کرے لیکن اگر کوئی دوسرا مکتب فکر اس حدیث کو قابل عمل سمجھتا ہے اور اس حدیث پر عمل کرنا قرآن وحدیث کے کسی حکم کے مخالف بھی نہیں ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم تمام مکاتب فکر کی رائے کا احترام کریں، مثلاً ماہ رجب کی ابتداء پر آپؐ سے (**اللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ رَجَبَ وَ شعبانَ و بَلِّغنا رمضان**) پڑھنا ثابت ہے اور یہ حدیث مسند احمد، بزار، طبرانی، بیہقی جیسی کتابوں میں موجود ہے جن کو پوری امت مسلمہ نے قبول کیا ہے۔ تو جو علماء اس حدیث کی سند پر اعتراض کرتے ہیں وہ یہ دعا نہ پڑھیں، لیکن اگر علماء کرام کی ایک جماعت اس حدیث کو قابل عمل سمجھ کر یہ دعا مانگتی ہے تو ان کے بدعتی ہونے کا فتویٰ صادر کرنا کون سی عقل مندی ہے۔ اسی طرح علماء، فقہاء اور محدثین کی ایک بڑی جماعت کی رائے ہے کہ پندرہویں شعبان سے متعلق احادیث کے قابل قبول ہونے اور امت مسلمہ کا عمل ابتداء سے اس پر ہونے کی وجہ سے پندرہویں شعبان کی رات میں انفرادی طور پر نفل نمازوں کی ادائیگی، قرآن کریم کی تلاوت، ذکر اور دعاؤں کا کسی حد تک اہتمام کرنا چاہئے۔ لہٰذا اس نوعیت سے پندرہویں شعبان کی رات میں عبادت کرنا بدعت نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

✦.....❖.....✦

کامیاب تاجر

❖ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

اللہ کی دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں انسان کو اپنے نفع اور نقصان کی فکر زیادہ رہتی ہے وہ جو کام کرتا ہے اس میں پہلے اندازوں اور تخمینوں کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور جب اس کی طبیعت مطمئن ہوجاتی ہے کہ اس عمل میں نفع ہے نقصان نہیں۔تو اس عمل کو انجام دینے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوتا، یہ ایک کسوٹی ہے اسی کی بنیاد پر وہ زندگی کے تمام گوشوں کو کنگھالتا اور آگے بڑھتا ہے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو نقصان اٹھاتا ہے مگر عجیب بات ہے کہ تمام تر ہوشیاریوں اور عقلمندیوں کے باوجود آدمی ہی ایسے کام کرتا ہے جس میں نتیجہ خسارہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اسی خسارہ سے بچانے کے لیے اور دین ودنیا میں سرخ رو ہونے کے لیے اسلام رہنمائی کے لیے آیا اور انسان کی بہتری کا پیغام لے کر آیا اس پیغام کو کچھ نے دل سے سنا، کچھ نے بے دلی سے، جنھوں نے دل سے سنا وہ اسلام کی پناہ میں آگئے اور جنھوں نے بیزاری دکھائی وہ اسلام سے دور ہوگئے، جو قریب آئے اسلام نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور پھر زندگی کی باریکیوں، نزاکتوں، تقاضوں اور ضرورتوں سے واقف کرایا، فرد سے معاشرت تک کا سفر کس طرح طے کرنا ہے اس کو جزو وکل کے ساتھ بیان کردیا۔آپ کہیں گے یہ کیسے ہوا تو دیکھ لیجئے آدمی اکیلا ہے پوری دیانت اور امانت کے ساتھ زندگی گزارے، کسی کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے اللہ کی عبادت اور اس کی بزرگی کا اعتراف اس کا کام ہے۔کسی کا رشتہ دار یا قریبی عزیز نہ ہونا اس کی علامت نہیں کہ وہ اب انسانی تقاضوں سے بھی آزاد ہوگیا اور اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کے حقوق بھی اس کے ذمہ نہ رہے۔پڑوسی ہے اس کا حق تو ادا کرنا ہے، ہمسایہ کے لیے اسلام نے جو قربانی دینے کی تاکید کی وہ دینی ہے۔

اسلام نے انسانی فطرت کے پیش نظر اور اس کی سرشت پر واقف ہونے کی بناء پر ایک ایسا نظامِ زندگی دیا ہے جس پر چلنے سے اور جس کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے سے وہ سکون کی اور راحت کی زندگی گزارے گا اگر اس نے اسلام سے بغاوت کی تو دنیا میں بھی زحمتوں میں پڑے گا اور یوم الحساب میں بھی۔وہ مشکلات میں گھرے گا، اسلام اپنے ماننے والوں کو جو حقیقی معنی میں اس کے احکامات اور تعلیمات پر اللہ کی خوشنودی کے لیے عمل کرتے ہیں ان کو اس کی ضمانت دیتا ہے کہ دنیا میں قلبی سکون اور روحانی تازگی کے ساتھ اپنا وقت گزارے گا اور جب یہاں سے رخصت ہوگا تو فضلِ خداوندی پر اس کی نگاہیں ٹکی ہوں گی اور اس کو کسی چیز کی فکر نہیں ہوگی ہم نے مضمون کے

شروع میں لکھا کہ انسان اس سودے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا جس میں اسے نقصان ہونے کا اندیشہ ہو وہ تجارت کرتا ہے تو اس تجارت کو آگے بڑھاتا ہے جس میں اسے دو پیسہ کا نفع ہو۔ وہ اپنی دکان پر وہ سامان رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو رکھا ہی رہے اور جس کے لیے گاہک تلاش کرنے کی نوبت آجائے خود سے کوئی اس سامان کا خریدار بن کر دکان پر نہ پہنچے پھر اس سامان کو بھی دکاندار جلدی بیچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جس کے جلد خراب ہو جانے کا اندیشہ اور خدشہ ہو ممکن ہے اس سامان کا خریدار ہی فراہم نہ ہو اور اتنے میں وہ سامان سڑ گل کر نقصان کی طرف لے جائے۔

اللہ سے لو لگانے والے، اس کی ذات پر یقین کامل رکھنے والے اور اسی بلند و بالا ہستی کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھنے والے اس پر آگاہ ہیں کہ ان اعمال کی طرف رخ نہ کریں جو خدائی ناراضگی کا سبب اور وجہ بنتے ہیں کیوں کہ ان بندوں کو اللہ نے اس کی صلاحیت دی ہے اور اس سمجھ سے نوازا ہے جسے دینی سمجھ کہتے ہیں، اسی لیے وہ اس راہ کے مسافر نہیں بنتے جس راہ میں لٹنے اور پٹنے کا خطرہ ہو، اس تاجر کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر دانی ہے جو سچائی اور دیانت کے ساتھ کاروبار کرتا ہے، دھوکا نہیں دیتا جھوٹ نہیں بولتا خراب سامان کو اچھا سامان کہہ کر اور بوسیدہ سامان کو پائیدار سامان بتا کر فروخت نہیں کرتا امانت داری سے اپنے کاروبار کو آگے بڑھاتا ہے ایسے تاجر کے انجام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باخبر فرمایا ہے ارشاد ہے: ''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پوری سچائی اور امانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا''۔ (ترمذی شریف)

ایسے ہی ایک دوسری حدیث میں منقول ہے: ''حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تاجر لوگ قیامت کے دن گنہگار اٹھائے جائیں گے سوائے ان تاجروں کے جنھوں نے اپنی تجارت میں پرہیزگاری اختیار کی یعنی خیانت اور فریب دہی وغیرہ میں مبتلا نہیں ہوئے، اور نیکی کی یعنی اپنے تجارتی معاملات میں لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور سچ پر قائم رہے'' (ترمذی شریف)

ہم دنیا دار لوگ اس شخص کو کامیاب تاجر تصور کرتے اور سمجھتے ہیں جس کا مال خوب فروخت ہوتا ہو جس کی دکان پر خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی ہو جسے سر کھجانے کی فرصت نہ ہو اس کی دکان پر کافی نوکر چاکر ہوں، دولت کی ریل پیل ہو، ادھر سامان آیا اور اِدھر فروخت ہو گیا، اس کی مصنوعات اگر موجود ہیں تو لوگوں میں وہ مشہور اور قابلِ قبول ہوں گاہک ان کی تلاش میں ایک دکان سے دوسری دکان چکر لگاتے ہوں، یہ معیار دنیاوی اعتبار سے ہے دینی اعتبار سے معیار یہ ہے کہ تاجر پرہیزگاری اور تقویٰ کے ساتھ معاملات کرے اسے اپنے نفع کے ساتھ ساتھ گاہک کے مفادات کا بھی بھرپور خیال ہو وہ صرف تجارت اسی کو نہ سمجھتا ہو کہ اپنی تجوری بھر لے بلکہ اسے یہ احساس بھی ہو کہ گاہک کو اس کی ضرورت کی چیز ملے، پائیدار ملے اور اچھی ملے۔ پھر جو نفع وہ لے رہا ہے اس میں توازن ہو، لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹنا اس کا منشاء نہ ہو اعتدال کے ساتھ کاروبار کرنا ایک کامیاب تاجر کی علامت ہے اس لیے کہ ایسا تاجر دنیا میں تو ہم کامیاب دیکھ ہی رہے ہیں آخرت میں بھی وہ کامیاب ہوگا اگر اس نے ان اصولوں اور ضابطوں کے تحت اپنے کاروبار کو قائم اور باقی رکھا جو ضابطے اور اصول اسلام نے اسے فراہم کئے ہیں۔

✦.....❖.....✦

(پہلی قسط)

عالمِ اسلام کے خلاف شیعوں کی ریشہ دوانیاں

❖ مولانا مفتی وصی احمد قاسمی
استاذِ حدیث وناظم تعلیمات جامعہ ہٰذا
موبائل: 09897344431

۹ر فروری ۶۱۰ء سرزمین مکہ پر اسلام کی آمد سے ہی اگر چہ اس کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور اسلام واہل اسلام پر جبر وتشدد کے نئے نئے تجربات کیے گئے، لیکن ہجرت مدینہ کی برکت سے نہ صرف ظلم وستم کا یہ سلسلہ تھما بل کہ مسلمان ایک اسلامی مملکت قائم کرنے میں کام یاب ہوگئے، اس وقت سے اسلام پوری برق رفتاری کے ساتھ عرب میں پھیلنے لگا تا آں کہ آپؐ کی وفات کے وقت تقریباً پورا جزیرۃ العرب اسلام کا حلقہ بگوش ہوگیا، خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فتنۂ ارتداد کی سرکوبی کے بعد باقی ماندہ علاقے بھی زیر نگیں کر لیے۔ جب حضرت فاروق اعظمؓ کا دور آیا تو اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر وقت کی دو عظیم الشان سلطنتوں میں داخل ہو رہا تھا اور جب اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے تو یرموک اور قادسیہ میں ان دونوں مملکتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور ان کے بیش تر علاقے اسلامی ریاست کا حصہ بن گئے۔ یہی صورتِ حال خلیفہ ثالث حضرت عثمان ذوالنورین کے دور میں بھی باقی رہی۔ مجاہدین کے گھوڑے مشرق میں کابل تک اور مغرب میں مراکش تک پہنچ چکے تھے۔ دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں اس پر مستزاد تھیں، اس طرح اسلام صرف اٹھائیس سالوں میں دنیا کی سب سے عظیم طاقت بن چکا تھا۔

ایسے میں دین و دیانت کے روایتی دشمن یہود بے بہبود نے محسوس کیا کہ اب اسلام سے رات ٹکر لینا اور عسکری میدان میں اسے فنا کرنا ممکن نہیں ہے۔ طریقہ تبدیل ہونا چاہئے، عیسائیت کی مثال ان کے سامنے تھی جس کو وہ پولس یہودی (سینٹ پال) کے ذریعہ مسخ اور محرف کر چکے تھے، چناں چہ منصوبے کے تحت ایک یمنی یہودی عبداللہ ابن سبا نے اپنے اسلام کا دعویٰ کر دیا اور اسلام کے بہت بڑے وفادار وجاں نثار کے طور پر اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور عام لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر دین اسلام میں کچھ ایسی تحریف کی جو ایک معتد بہ طبقے کے حلق سے نیچے اتر گئی، اسلام کی یہی تحریف ابتداء میں سبائیت اور آگے چل کر شیعیت کہلائی۔ دونوں تحریفی

کوششوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی تحریف کے نتیجے میں دین عیسوی بالکلیہ ختم ہوگیا، جب کہ دوسری تحریف کے نتیجے میں اسلام تو اپنی اصل شکل وصورت میں باقی رہا، البتہ اسلام کا نام لیوا ایک اسلام دشمن فرقہ شیعیت کی شکل میں وجود میں آ گیا۔ اس طرح یہودی اسلام کو ختم تو نہیں کر سکے، البتہ اسلام کے خلاف اسلام ہی کے نام سے ایک خوف ناک محاذ قائم کرنے میں کام یاب ہوگئے، جس نے اسلام دشمنی میں مجوسیوں، صلیبیوں اور صہیونیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ذیل میں اسی سلسلے کے چند واقعات قارئین کی عبرت کے لئے ذکر کئے جارہے ہیں۔

شہادت عثمانؓ : شیعی ریشہ دوانی کا اولین نمونہ خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہے، بانی شیعیت عبداللہ ابن سبا نے اپنی اسکیم کے تحت عالم اسلام کے تین اہم مراکز کوفہ، بصرہ اور مصر میں اپنے ہم خیال کچھ لوگ پیدا کئے، انہیں یہ یقین دلایا کہ حضرت عثمان کی خلافت غاصبانہ بھی ہے اور ظالمانہ بھی۔ انہوں نے نہ صرف حضرت علیؓ کے حق خلافت کو چھینا ہے، بل کہ اپنے نااہل اقرباء کو بڑے بڑے مناصب دے کر عوام پر ظلم کر رہے ہیں، جب کہ دونوں باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلی بات تو ظاہر ہے، رہا مسئلہ اقرباء پروری کا، تو اس کی اصلیت محض اتنی ہے کہ بعض اہم عہدیداران اموی ضرور تھے لیکن قرابت کی بنیاد پر نہیں، بل کہ اپنی بے پناہ قابلیت کی بنیاد پر۔ حضرت امیر معاویہ، حضرت عبداللہ ابن سعد، حضرت عبداللہ بن عامر اور حضرت عقبہ بن عامر کے کمال جہاں بانی کا انکار کون کرسکتا ہے، بہرحال عبداللہ بن سبا کی تحریک پر حج کے موقع پر بعنوان حج تین جگہوں سے ایک ایک ہزار بلوائیوں کا گروہ روانہ ہوا، ارادہ تھا کہ بعد حج جب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہوں گے، ہم وہاں رک کر اچانک حضرت عثمان کو معزول یا قتل کر دیں گے، کوفہ کا سرغنہ مالک اشتر، بصرہ کا سرغنہ حرقوس بن زہیر اور مصر کا سرغنہ عبدالرحمٰن بن عویس تھا۔

اختتام حج پر حسب پروگرام بلوائیوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کرلیا اور ان کو تنگ کرنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عثمان کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی کا جانا بند کر دیا، اس وقت مدینے میں عام آدمی بھی اتنے تھے کہ اگر حضرت عثمان حکم دیتے تو چند دنوں میں بلوائیوں کا صفایا ہوجاتا لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' حضرت عثمان نے اس خیال میں کہ یہ میرے ہی اسلامی بھائی ہیں جو مجھ سے ناراض ہیں، ان کے خلاف طاقت کے استعمال سے گریز کیا، اکابر صحابہ حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کو جب یہ اطلاع ملی کہ بلوائی گھر میں گھس کر خلیفۂ وقت کی بے حرمتی کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے اپنے صاحب زادوں کو بتا کیدا امیر المؤمنین کے گھر کی حفاظت پر مامور کر دیا، ادھر بلوائیوں کو اندیشہ ہوا کہ محاصرے کی خبر سن کر خلافت کے گورنروں نے ضرور مدینہ کی طرف فوجیں روانہ کی ہوں گی، اگر ایسا ہوا تو مقصد برآری ناممکن ہوجائے گی، لہٰذا

انہوں نے بعجلت خفیہ طور پر پڑوس کی دیوار سے کود کر حضرت عثمانؓ پر حملہ کر دیا۔ عمیر بن جنابی نے ٹھوکریں مار کر پسلیاں توڑ دیں اور کنانہ بن بشیر نے تلوار سے شدید زخمی کر دیا۔ چھت اور دروازے کے محافظین کو جب تک خبر ہوتی آپؓ شہید ہو چکے تھے، حملے کے وقت آپؓ تلاوت میں مصروف تھے، ترکی میوزیم ''توپ کاپے'' میں آج بھی قرآن پاک کا وہ نسخہ یادگار موجود ہے جس میں آیت کریمہ ''**فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم**'' پر آپ کے خون کے دھبے صاف نظر آتے ہیں۔

جنگ جمل : سانحۂ عثمانی کے وقت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حج کی وجہ سے مکہ میں مقیم تھیں اور واپس ہونا چاہتی تھیں، جب انہیں اس کی اطلاع ملی تو واپسی کا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا واللہ عثمان مظلوم مارے گئے، میں ان کے خون کا بدلہ ضرور لوں گی، اسی دوران حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی مکہ پہنچ گئے اور انہوں نے بتایا کہ مدینہ پر بلوائیوں کے قبضے کی وجہ سے وہ یہاں بھاگ کر آئے ہیں، طے یہ ہوا کہ ہم سب کو مل کر ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ حضرت علی خلیفہ بن چکے تھے اور مدینے ہی میں تھے لیکن بلوائیوں کے سامنے بے بس تھے بلکہ بلوائی ان پر مسلط تھے، ان تینوں حضرات نے یہ سمجھا کہ حضرت علی قاتلان عثمان کے تئیں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور ان سے قصاص نہیں لینا چاہتے۔ اس لئے مقابلہ کی یہ تیاری صرف بلوائیوں کے خلاف نہیں حضرت علی کے بھی خلاف تھی۔ بصرہ اس وقت ایک مضبوط صوبہ تھا اور وہاں حضرت طلحہ و زبیر کے حامیوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، اس لئے رائے یہ ہوئی کہ وہاں پہنچ کر ایک بڑی جمعیت فراہم کی جائے اور پھر حضرت علی سے جنگ کر کے قصاص عثمان پر ان کو مجبور کیا جائے۔

ادھر حضرت علیؓ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو بہت صدمہ ہوا اور بادل ناخواستہ بصرے کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کے ہم راہ مخلصین کے پہلو بہ پہلو سبائی بلوائی بھی تھے جن میں کچھ سے آپ واقف تھے اور کچھ سے ناواقف۔ بصرہ کے قریب پہنچ کر قصر عبیداللہ نامی مقام کے میدان میں حضرت علی خیمہ زن ہو گئے۔ ادھر سے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی آ کر اسی میدان میں فروکش ہو گئے، تین دن تک فریقین میں مذاکرات ہوتے رہے، دونوں نے ایک دوسرے کا عندیہ معلوم کیا کہ وہ کیوں نکلے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ حضرت عائشہ وغیرہ نے کہا کہ ہمارا مقصد قاتلین عثمان سے قصاص لینا ہے جو آپ کے ساتھ ہیں اور آپ ان کے تئیں سستی کر رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا گواہ ہے میں بھی قصاص عثمان کے تئیں پرعزم ہوں، البتہ اتنا چاہتا ہوں کہ پہلے خلافت کا معاملہ مستحکم ہو جائے، دوسرے فریق نے کہا کہ جب ایسا ہے تو ہمارا دل آپ سے صاف ہے اور ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ الغرض اس ملاقات کے نتیجے میں جنگ و پیکار کے خیالات طرفین نے اپنے دلوں سے نکال ڈالے۔ حضرت علی کی طرف سے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت طلحہ و زبیر کی جانب سے حضرت محمد بن

طلحہ نے شرائط صلح طے کئے اور یہ بات قرار پائی کہ کل صبح صلح نامہ لکھا جائے گا اور اس پر فریقین کے دستخط کے بعد دونوں طرف کی افواج واپس چلی جائیں گی۔

سبائی یہ دیکھ کر بہت فکر مند ہوئے اور ان کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی، رات بھر مشورے کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے صبح کے قریب حضرت طلحہ وزبیر کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ دوسری طرف سے بھی جوابی کارروائی شروع ہوگئی، شور وشغب سن کر حضرت طلحہ وزبیر اپنے خیموں سے نکلے تو انہیں یہ بتایا گیا کہ حضرت علیؓ کی فوج نے اچانک حملہ کر دیا ہے، دونوں کہنے لگے: افسوس علی بغیر کشت وخون کے باز نہیں آئیں گے۔ ادھر حضرت علیؓ نے جب حقیقت معلوم کی تو انہیں یہ اطلاع دی گئی کہ طلحہ وزبیر نے بے خبری میں ہم پر حملہ کر دیا ہے اور ہم مجبوراً اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: افسوس طلحہ وزبیر خون ریزی کر کے رہیں گے اور پھر باضابطہ لڑائی شروع ہوگئی، اور سخت ہوئی کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ حضرت علیؓ کی طرف سے ایک ہزار سے زائد اور حضرت عائشہ وطلحہ وزبیر کی طرف سے تقریباً نو ہزار افراد اس خانہ جنگی کا ایندھن بن گئے۔ الغرض پورا میدان خونِ مسلم سے لالہ زار ہوگیا، اختتام جنگ پر حضرت عائشہ نے فرمایا: کاش میں اس دن سے پہلے ہی مر جاتی، بعینہ یہی جملہ حضرت علی سے بھی منقول ہے۔ اس جنگ کا مرکز چوں کہ حضرت عائشہؓ کا اونٹ بن گیا تھا، اس لئے تاریخ میں یہ جنگ ''جنگ جمل'' کے نام سے مشہور ہے۔

جنگ صفین : جنگ جمل کی خون ریزی کے بعد بھی سبائیوں کو چین نہیں آیا، بل کہ حضرت علی اور حضرت عائشہ وطلحہ وزبیر کی باہمی گفتگو سے انہیں یقین ہوگیا کہ یہ سب مخلص ہیں اور ان کا مطمح نظر ایک ہی ہے، انہیں اندیشہ ہوا کہ اب جب کہ حضرت علی ایک بڑا فتنہ فرو کرنے کے بعد اپنے کو کافی مضبوط محسوس کر رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ قصاص عثمان کا سلسلہ شروع کر دیں اور ہم بے موت مارے جائیں، انہوں نے بالواسطہ حضرت علی کو یہ باور کرانا شروع کیا کہ ابھی تو آپ نے ایک کم زور حروف کو زیر کیا ہے، اصل حریف تو گورنر شام امیر معاویہ ہیں، جو دن بہ دن اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر رہے ہیں اور اب تک انہوں نے آپ کی خلافت بھی تسلیم نہیں کی ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت علی ابھی تک حضرت معاویہ سے دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور سفارت سے مسئلے کا حل چاہتے تھے لیکن سبائیوں کی در پردہ تحریک اور خلیفۂ برحق ہونے کے ناطے انہوں نے حضرت معاویہ سے لڑنے کا ارادہ کر لیا۔

ماہ ذی قعدہ ۳۷ھ میں حضرت علی کوفے اور بصرے کی نوے ہزار فوج لے کر مقابلے کے لئے نکل پڑے۔ حضرت معاویہ کو پتہ چلا تو وہ بھی اسّی ہزار شامیوں کے ساتھ روانہ ہوگئے، دریائے فرات کے قریب مقام صفین میں پہنچ کر دونوں فوجیں خیمہ زن ہوگئیں، شامیوں نے یہ کہہ کر کہ قاتلین عثمان نے حضرت عثمان پر پانی بند کر کے

انہیں پیاسا شہید کیا تھا۔ ساحل فرات پر قبضہ کرلیا، لیکن حضرت عمرو بن العاص کے کہنے پر قبضہ ختم کر دیا گیا، حضرت علی و حضرت معاویہ میں سے کوئی بھی دل سے جنگ نہیں چاہتا تھا، اس لئے فریقین میں قاصدوں کے ذریعے دو مرتبہ صلح کا دور چلا اور قریب تھا کہ دونوں کسی نتیجے تک پہنچ جائیں، لیکن سبائی جماعت پورے طور پر سرگرم رہی، اس کی بھرپور کوشش رہی کہ کسی طرح دونوں جماعتوں میں ہم دردی کا جذبہ پیدا نہ ہونے پائے۔ چناں چہ باہمی مذاکرات سے پسیجنے والے دل لشکر میں واپس آ کر ان کے پروپیگنڈے سے سخت ہو جاتے تھے، بالآخر وہی ہوا جو سبائیوں کا منشا تھا، مذاکرات ناکام ہو گئے۔

یکم صفر کو حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ نے اپنے اپنے لشکریوں کو ہدایت دی کہ بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے، زخمیوں کا مال نہ چھینا جائے، کسی لاش کی بے حرمتی نہ کی جائے اور عورتیں اگر گالیاں بھی دیں تو ان پر کوئی زیادتی نہ کی جائے۔ ان ہدایات کے بعد باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی، آٹھ روزہ جنگ و پیکار کے بعد جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، تو حضرت علی نے غنیم پر ایک فیصلہ کن حملے کا حکم دیا، علوی سپہ سالار نے ایک خاص تکنیک سے ایسا سخت حملہ کیا کہ شامی حواس باختہ ہو گئے۔ وہ اگرچہ اب بھی پوری قوت سے مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھا اور مقابلہ بظاہر برابر سرابر کا تھا، لیکن جنگی ماہرین کی نظر میں اب شامیوں کی شکست میں گھنٹوں نہیں منٹوں کی دیر تھی، ایسے میں شامی کمانڈر نے فوج کو حکم دیا کہ فوراً قرآن کریم کو نیزوں پر بلند کریں اور اعلان کریں کہ "**ھٰذا کتاب اللّٰہ بیننا و بینکم**" کہ اللہ کی کتاب ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک جنگی چال تھی، حضرت علی فوراً بھانپ گئے اور حکم دیا کہ لڑائی جاری رکھی جائے، لیکن سبائی ایک بار پھر حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ مسلمان کسی ایک امیر کے پرچم تلے متحد نہ ہوں۔ حضرت علیؓ پر دباؤ بناتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ نے جنگ بندی کا حکم نہیں دیا تو آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو عثمان کے ساتھ ہوا ہے۔ حضرت علیؓ چار و ناچار اس پر آمادہ ہو گئے، اس طرح یہ جنگ سبائیوں کی وجہ سے وقوع پذیر بھی ہوئی اور اختتام پذیر بھی اور اس میں جو جانی نقصان ہوا، وہ اسلام کی جنگی تاریخ کا سب سے بڑا جانی نقصان ہے، یعنی کل اسّی ہزار۔

سانحۂ کربلا : سن ۶۰ھ میں حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد جب یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا تو بعض اکابر شخصیات نے اس کے لئے بیعت کرنے سے انکار کر دیا، اس کا کچھ سبب جہاں اس کا کردار تھا تو اس سے بڑا سبب اس کی ولی عہدی کی وہ رسم تھی جس نے آئندہ کے لئے اسلام میں نسلی حکومت کا نہ بند ہونے والا دروازہ کھول دیا اور وہ شورائیت ختم ہو گئی جو اسلامی طرزِ حکومت کی جان تھی، بیعت سے انکار کرنے والوں میں نواسۂ رسول جگر گوشۂ بتول حضرت حسینؓ بھی تھے، لیکن ان کا کوئی ارادہ حکومت وقت سے ٹکرانے کا نہیں تھا، بل کہ وہ اس واقعے کے بعد مکہ مکرمہ جا کر بیت اللہ کے جوار میں گوشہ گیر ہو گئے تھے۔

لیکن فتنہ پسند سبائی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے، کوفہ سے انہوں نے حضرت حسین کی خدمت میں مسلسل اس مضمون کے خطوط بھیجے کہ اسلام اس وقت سنگین خطرے سے دوچار ہے، ایک فاسق و فاجر شخص نے تخت خلافت پر قبضہ کرلیا ہے، صرف آپ ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں، برائے کرم جلد تشریف لائیں، کوفہ کی ایک لاکھ سپاہ آپ کے دست حق پرست پر بیعت کے لئے بے تاب ہیں۔'' جب اس نوعیت کے ایک دو نہیں ہزاروں خطوط حضرت حسین کی خدمت میں پہنچے تو آپ قدرتی طور پر بے چین ہوگئے اور کوفہ جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ حضرات صحابہ بالخصوص حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ ابن عباس کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے روکنے کی بہرنوع کوشش کی، انہوں نے عرض کیا کہ یہ وہی کوفی ہیں جو اس سے قبل آپ کے والد اور بھائی کے ساتھ غداری کر چکے ہیں، آپ ان پر اعتبار نہ کریں، لیکن آپ اپنا ارادہ بدلنے پر تیار نہ ہوئے، پہلے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو تحقیق احوال کے لئے کوفہ بھیجا، جب انہوں نے اطلاع دی کہ حالات بہت بہتر ہیں اور پہلے ہی دن بارہ ہزار لوگوں نے نیابتاً میرے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے تو آپ فوراً مع اہل وعیال مکہ سے روانہ ہوگئے، یہ قافلہ جب مقام ''ثعلبہ'' میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت مسلم کوفہ میں شہید کردیے گئے اور اب کوئی شخص کوفہ میں ان کا حمایتی نہیں ہے۔ یہ خبر قافلے پر بجلی بن کر گری اور ارادہ تبدیل ہونیلگا، لیکن مسلم کے بیٹوں نے کہا کہ ہم ہرگز واپس نہیں ہوں گے، اب تو ہم مسلم کا قصاص لیں گے ورنہ انہیں کی طرح جان دیدیں گے۔ دوسرے یہ کہ حضرت حسین مسلم بن عقیل کی طرح نہیں ہیں، انہیں جب کوفہ والے دیکھیں گے تو ضرور ان کے ساتھ ہوجائیں گے، اس طرح سفر پھر جاری ہوگیا۔ اب تک اس قافلے میں ہزاروں لوگ شامل تھے اور راستے میں آ آ کر اس کی تعداد میں اضافہ کررہے تھے لیکن اس خبر کے سننے کے بعد جب قافلہ آگے بڑھا تو لوگ بتدریج علیحدہ ہونے لگے، تا آں کہ خاص آپ کا خانوادہ باقی رہ گیا جس کی تعداد ۷۲ بتائی جاتی ہے، وہاں سے آپ نے کوفہ شہر کا قصد کیا لیکن عمرو بن سعد کی کمان میں گورنر عراق ابن زیاد کی فوج نے گھیر کر اس ویرانے میں پہنچا دیا جسے دنیا ''کربلا'' کے نام سے جانتی ہے۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس موقع پر عمرو بن سعد نے تنہائی میں حضرت حسین سے عرض کیا کہ بے شک آپ یزید کی بہ نسبت خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن خدائے تعالیٰ کو شاید یہ منظور نہیں کہ آپ کے خاندان میں حکومت و خلافت آئے۔ حضرت علی اور حضرت حسن کے حالات آپ کے سامنے ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ آپ اس خیال کو چھوڑ دیں ورنہ آپ کی جان کو خطرہ ہے اور ہم آپ کی گرفتاری پر مامور ہیں۔''

حضرت حسین کو اس مشورے میں اخلاص نظر آیا، آپ نے فرمایا: میں اس وقت تین باتیں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، تم ان میں سے جسے چاہو منظور کرلو: (۱) جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس جانے دو (۲) کسی سرحد کی طرف

نکل جانے دو کہ وہاں کفار کے ساتھ جہاد کرتا ہوا شہید ہو جاؤں (۳) یزید کے پاس دمشق جانے دو کہ اس سے میں براہِ راست اپنا معاملہ طے کرلوں گا جس طرح میرے بڑے بھائی حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہ سے کیا تھا۔

عمرو بن سعد یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ بالیقین اب کوئی صورت بہتری کی نکل آئے گی، اس نے بذریعہ قاصد ابن زیاد کو یہ تجاویز پہنچا دیں، قریب تھا کہ ابن زیاد حضرت حسین کو یزید کے پاس جانے کی اجازت دیدیتا اور مسئلہ حل ہو جاتا لیکن وائے رے امت کی حرماں نصیبی! وہاں بد بخت شمر ذی الجوشن بھی موجود تھا، اس نے ابن زیاد کو یہ کہہ کر ورغلایا کہ اگر حسین یزید کے پاس پہنچ گئے تو وہ آپ سے زیادہ مرتبہ حاصل کرلیں گے اور آپ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جائے گی۔ مناسب یہ ہے کہ حسین کو ختم کر دیا جائے۔

ابن زیاد کو یہ بات سمجھ میں آ گئی، کہلا بھیجا کہ تینوں میں سے کوئی بات منظور نہیں ہوسکتی، صرف ایک صورت ممکن ہے وہ یہ کہ حسین اولاً میرے ہاتھ پر نیابتاً یزید کی بیعت کریں، پھر میں اپنے طور پر انہیں یزید کے پاس بھیج دوں گا۔

حضرت حسین کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس سے تو مرجانا بہتر ہے کہ میں ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ اس طرح مصالحت کی آخری کوشش بھی ناکام ہوگئی اور عراقی فوج مقابلے پر آ گئی۔ میدان جنگ میں جب آپ نے دیکھا کہ مقابلے پر آنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے مجھے باصرار یہاں بلایا ہے تو آپ کو سخت حیرت ہوئی اور آپ نے ایک ایک کا نام لے کر پکارا کہ اے شیث بن ربعی، اے حجاج بن حسن، اے قیس ابن اشعث اور اے فلاں اور فلاں! کیا تم لوگوں نے یہاں آنے کے لئے مجھے خطوط نہیں لکھے اور جب آ گیا ہوں تو میرے قتل کے درپے ہو۔

سب نے بیک زبان کہا کہ ہم نے آپ کو کوئی خط نہیں لکھا اور اگر لکھا بھی تو اب علی الاعلان آپ سے اظہارِ براءت کرتے ہیں، بالآخر جنگ ہوئی اور جو روح فرسا، دل خراش اور تباہ کن نتائج ظہور پذیر ہوئے وہ دنیا کے سامنے ہیں۔ تاریخ کا معمولی طالب علم بھی ان سے واقف ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حضرت حسین کو کوفہ بلانے والے اور میدانِ کربلا میں بے دردی سے شہید کرنے والے شیعہ ہی ہیں اور اب ان کا اس سانحے پر رونا اور ماتم کرنا بھی اہل نظر کے نزدیک اس کا بہت بڑا قرینہ ہے۔

آخر میں یہاں ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ شمر ذی الجوشن ملعون نے حضرت حسین کے قتل کی رائے کیوں دی اور خود حضرت حسین کو ابن زیاد کے ہاتھ پر نیابتاً یزید کی بیعت کرنے سے اس قدر شدید انکار کیوں تھا جب کہ وہ خود یزید سے مل کر اپنے بھائی کی طرح معاملہ سلجھانے کی پیش کش کر چکے تھے۔

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بقول مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی شمر ذی

الجوشن حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی ایک اہلیہ ام البنین بنت حرام کا بھائی تھا جن سے حضرت علی کے بیٹے جعفر عثمان اور عبداللہ تھے، اس نے آج کے ماحول کے مطابق غالباً یہ چاہا کہ حسین ختم ہو جائیں اور حضرت علی کی موروثی عظمت و فضیلت کا وارث میرا کوئی بھانجا بن جائے، لیکن اپنے اس مقصد میں وہ بری طرح ناکام ہوا، آج جعفر، عثمان اور عبداللہ کی بابت کوئی نہیں جانتا کہ یہ بھی حضرت علی کے صاحبزادے تھے، جب کہ حضرت حسین کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے۔ رہی بات ابن زیاد کے ہاتھ پر بیعت سے حضرت حسین کے شدید انکار کی، تو اس کا سبب بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابن زیاد کے باپ زیاد کے نسب کے بارے میں لوگوں کو شبہات تھے، ایسے میں حضرت حسین کی غیرت وحمیت نے کسی طور یہ گوارا نہیں کیا کہ خلافت جیسے خالص ایک دینی مسئلے میں اپنا ہاتھ ابن زیاد کے ہاتھ میں دیدیں، خواہ اس کے لئے انہیں اپنی جان ہی گنوانی پڑے، باقی صحیح علم اللہ کو ہے۔ **وما اوتیتم من العلم الاّ قلیلاً**.

قرامطہ بحرین : ۲۷۸ھ میں کوفہ میں حمدان قرمط نامی ایک شخص ظاہر ہوا، یہ اسماعیلی شیعہ تھا، لیکن شیعوں سے الگ بھی کچھ چیزیں ایجاد کر رکھی تھیں۔ اس نے حضرت علی کے سب سے چھوٹے صاحب زادے حضرت محمد بن حنفیہ کو پیغمبر بتایا، بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا، نمازیں صرف دو وقت رکھیں، دو رکعت بوقت طلوع اور دو رکعت بوقت غروب، روزے بھی سال میں صرف دو دن فرض کئے، اس نے شراب کو حلال اور غسل جنابت کو غیر ضروری قرار دیا۔ اس کے متبعین بعد میں قرامطہ کہلائے اور موجودہ سعودی عرب کے مشرقی علاقے میں آگے چل کر انہوں نے ایک حکومت قائم کر لی، اس علاقے کو تاریخ میں کبھی احساء کبھی ہجر اور کبھی بحرین کہا گیا ہے۔ قدیم بحرین میں موجودہ ملک بحرین اور سعودی عرب کا صوبہ ''احساء'' اور اس کے شہر قطیف ہفوف، ظہران اور دمام شامل تھے، جہاں اب بھی شیعہ قابل ذکر تعداد میں موجود ہیں۔

تقریباً ستر سال اس علاقے میں قرامطہ کی حکومت قائم رہی، قریب ہی عباسی خلافت تھی، جس کی کم زوری سے فائدہ اٹھا کر قرامطہ آس پاس کی سنی آبادیوں پر پیہم حملے کرتے اور لوٹ مار مچاتے رہے۔ بوڑھے، بچے، عورتیں سبھی ان کی زد پر تھے اور مکانات، بازار اور مسجدیں کوئی بھی چیز ان سے محفوظ نہیں رہی، ان حکم رانوں میں سب سے خبیث اور تباہ کن ابوطاہر قرمطی تھا، اس نے اپنے پورے دور میں مسلمانوں کو مبتلائے کرب والم رکھا، بصرے کی جامع مسجد پر حملہ کر کے خاک وسیاہ کر دیا، حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنا اس کا خاص مشغلہ تھا۔

۳۱۳ھ میں کسی نے اس کے خوف سے حج نہیں کیا۔ ۳۱۸ھ میں مکہ مکرمہ پر حملہ کیا اور ایک ایک حاجی کو قتل کیا، کچھ لوگوں نے خانۂ کعبہ میں گھس کر جان بچانی چاہی لیکن ان کو بھی امان نہیں ملی، چاہ زمزم کو لاشوں سے پاٹ دیا، حجر اسود کو گرز مار کر نیچے گرا دیا، خانہ کعبہ کا دروازہ توڑ ڈالا اور ایک آدمی کو چھت اکھاڑنے کے لئے اوپر بھیجا لیکن وہ گر کر ہلاک ہو گیا، بعد ازاں حجر اسود کو اٹھا کر اونٹ پر رکھوایا اور اعلان کیا کہ آئندہ حج ہمارے یہاں ہوا کرے گا،

لوگوں نے بہت کوشش کی حجر اسود واپس مل جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور پورے ۲۱ سال تک حج بغیر حج اسود کے ہوتا رہا، بالآخر اس ملعون کو موت آئی تب جا کر یہ مبارک پتھر اپنی جگہ نصب ہوا، آج اگر ایرانی حجاج مناسک حج میں خلل ڈال رہے ہیں اور یمن کے حوثیوں کا سربراہ عبدالمالک حوثی کعبۃ اللہ پر چڑھائی کی دھمکی دے رہا ہے تو ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ یہ ان کے اجداد کی روایت رہی ہے۔

بنو بویہ دیلمی : چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں یہ ان کے علاقے ''دیلم'' سے بنو بویہ نامی ایک خاندان اٹھا اور ملک کے مختلف حصوں پر قابض ہو گیا، یہ عماد الدولہ، رکن الدولہ اور معز الدولہ نام کے تین بھائی تھے اور شیعہ تھے۔ تینوں بالترتیب فارس، اصفہان اور اہواز کے حکم راں بنے اور بڑا فساد مچایا، تعداد چوں کہ اہواز کا قریب ترین شہر تھا، اس لئے ایک شورش سے فائدہ اٹھا کر معز الدولہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا اور بالجبر عباسی خلیفہ مستکفی باللہ کا وزیر اعظم بن گیا، یہ چوں کہ ایک متعصب اور کٹر شیعہ تھا، اس لئے اس کا دور بغداد کی وزارت عظمیٰ کا تاریک ترین دور ہے، اس نے خلافت کی مٹی پلید کر دی، خلیفہ کی زندگی ایک قیدی کی ہو گئی، نوبت بایں جا رسید کہ ایک بار کسی بات پر ناراض ہوا کر اس نے بھرے دربار میں خلیفہ کو تخت سے کھینچ کر گھسیٹا اور دونوں آنکھیں نکال کر معزول کر دیا۔

اس کے عہد میں پہلی بار بغداد میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور شیعہ سنی جھگڑے ہونے لگے، اس نے استحکام حاصل کرنے میں پورے بغداد میں ۱۸ ذی الحجہ کو عید غدیر منانے کا حکم دیا، یہ وہ تاریخ ہے جس میں شیعوں کے بقول ''غدیر خم'' کے مقام پر آں حضور ﷺ نے اپنے بعد حضرت علی کی خلافت کا اعلان کیا تھا، اگلے سال اس نے ایک نیا حکم جاری کیا کہ ۱۰ محرم الحرام کو ساری دوکانیں بند کر دی جائیں، بیع وشراء بالکل موقوف رہے اور تمام لوگ ماتمی لباس پہن کر علی الاعلان نوحہ کریں، چنانچہ مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی سر بازار بال کھول کر اور کپڑے پھاڑ کر نوحے کئے۔ مسلم معاشرے میں عیدین کے علاوہ عید غدیر کے نام سے تیسری عید کا اضافہ اور اعلانیہ سڑکوں پر اور سرکاری سطح پر ماتم ونوحہ کی رسم اسی خبیث معز الدولہ کی ایجاد ہے۔ اس سے پہلے یہ دونوں رسمیں شیعوں میں بھی نہیں تھیں، اس کے علاوہ اس نے بغداد کی جامع مسجد کے دروازے پر یہ کفریہ عبارت بھی لکھوائی:

''لعن اللّٰہ معاویۃ بن سفیان و من غصب فدکا و من منع عن دفن الحسن عند جدہ و من نفی ابا ذر ومن اخرج العباس من الشوریٰ''.

سنی یہ سب دیکھتے رہے اور کڑھتے رہے، اس کے دور میں سنیوں کو جو اذیتیں پہنچیں ان کا تصور ہی بہت کرب انگیز ہے، اس نے بغداد میں جو خوں ریز شیعہ سنی کشمکش پیدا کی آج تک یہ شہر اس سے نکل نہیں سکا ہے اور خلافت بغداد کو جو اس نے طالع آزماؤں کی گیند بنایا وہ عظیم نقصان الگ ہے۔

حسن بن صباح : نیشاپور کے ایک مدرسے کے تین ساتھیوں نے تاریخ میں بڑا نام کمایا، یہ تھے

نظام الملک طوسی، عمر خیام اور حسن بن صباح، پہلے دونوں نے تو واقعی اپنے فضائل وکمالات کی بنیاد پر، لیکن تیسرے نے یہ اصول سامنے رکھا کہ ''بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا'' تیسرا شخص یعنی حسن بن صباح واقعی تاریخ کی ایک خوفناک شخصیت ہے۔ یہ شخص ۴۲۸ھ میں ''رے'' کے مضافات میں ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوا، حصولِ تعلیم کے بعد مصر پہنچا، وہاں فاطمی خلیفہ مستنصر عبیدی نے اس کا بڑا اعزاز واکرام کیا، سال بھر سے زائد وہ شاہی مہمان کی حیثیت سے وہاں مقیم رہا، اس دوران اس نے اسماعیلی عقائد سے بھرپور واقفیت حاصل کی اور خلیفہ کی طرف سے ''داعی کبیر'' کا خطاب حاصل کیا، واپس آکر وہ کچھ دنوں متفکر اور گوشہ نشین رہا، پھر شمالی ایران کے صوبے ''قہستان'' کے قلعہ ''الموت'' پہنچا، یہ قلعہ اپنی علیحدگی، بلندی، راہوں کی پیچیدگی اور اشیائے ضرورت کی فراوانی کے سبب نہایت مستحکم تھا، حسن بن صباح کو اپنے منصوبوں کے لئے یہ جگہ بہت موزوں نظر آئی، قلعہ کا حاکم مہدی علوی نامی ایک شخص تھا، حسن ایک محبّ اہل بیت بزرگ کی شکل میں اس کے پاس پہنچا اور اپنی مصنوعی بزرگی کے سحر میں اسے گرفتار کر کے قلعے ہی میں انتہائی اعزاز کے ساتھ رہنے لگا اور ایک دن موقع پا کر اسے ختم کر کے خود ہی اس قلعے پر قابض ہوگیا، اس قلعے میں بیٹھ کر اس نے ہر قسم کی مضبوطی کر لی اور اپنے معتقدین کو جمع کر کے اور اردگرد کے جاہل اور جنگ جو قبائل میں اپنا اثر قائم کرنے کے بعد باقاعدہ حکومت کرنے لگا، یہی حکومت تاریخ میں دولتِ باطنیہ، دولتِ فدائین اور دولتِ حشاشین کے نام سے مشہور ہوئی، بعد میں جب سلجوقیوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو اس حکومت نے اپنا رقبہ بھی کچھ وسیع کر لیا۔

فدائیوں کا دورِ حکومت عالم اسلام کے لئے سخت ابتلاء کا وقت ہے، حسن بن صباح نے اپنے قلعے میں ہر طرح کے سامان عیش سے بھرپور ایک مصنوعی جنت بنائی تھی، جس میں اپنے مریدوں کو حالت نشہ میں کچھ عرصے کے لئے بھیج کر دوبارہ حالت نشہ ہی میں وہاں سے واپس بلوا لیا کرتا تھا، ایسے لوگ ہوش آنے کے بعد یہ گمان کرتے تھے کہ انہیں حقیقی جنت سے دربدر کر دیا گیا ہے اور وہاں دوبارہ جانے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے تھے، ایسے لوگوں کو ''فدائین'' کہا جاتا تھا، حسن بن صباح انہیں فدائیوں کے ذریعے ڈاکے ڈلواتا، جاسوسی کراتا، مسلم حکومتوں میں انارکی پھیلاتا اور مسلم سلاطین، وزراء، فوجی قائدین، سرکردہ علماء، مصلحین اور صالحین پر قاتلانہ حملے کراتا، یہ فدائی اتنے جری اور اپنے کام میں ماہر تھے کہ بڑے بڑے بادشاہ اپنی خلوات گاہوں میں بے خوف وخطر نہیں رہ سکتے تھے، ان فدائیوں کے ہاتھوں جو لوگ شہید ہوئے ان میں خواجہ نظام الملک طوسی، مولانا روم کے پیر ومرشد حضرت شمس تبریزی، معود بن علی وزیر اعظم خوارزم شاہ اور سلطان شہاب الدین غوری بطور خاص قابل تذکرہ ہیں۔ امام رازی اور سلطان صلاح الدین ایوبی بھی ان کے ناکام مملوں کے شکار ہوئے، یہ چھوٹی سی حکومت اپنی دشوار گذار جائے وقوع کی وجہ سے مدتِ دراز تک قائم رہی، بالآخر ترکوں نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ حسن بن صباح سے شیعوں کا جو فرقہ چلا وہ آج کل برصغیر میں ''خوجہ'' کہلاتا ہے، اس کے سربراہ آغا خاں اسی

دولت باطنیہ کے شاہی خاندان کی یادگار ہیں، یہ فرقہ تجارت، عصری تعلیم میں بہت آگے ہے، کمپیوٹر بنانے والی مشہور کمپنی ''ویپرو'' کے مالک ارب پتی تاجر ''عظیم پریم جی'' خوجہ ہی ہیں۔

سقوط بغداد : خلافتِ عباسیہ کے دور زوال میں ایک ناسمجھ خلیفہ مستعصم باللہ گذرا ہے، اس نے وزراتِ عظمیٰ جیسا اہم منصب ابن العلقمی نامی ایک شیعہ کو دیدیا، یہ بظاہر نورو وادار تھا، لیکن اندرونی طور پر ایک متعصب اور غالی شیعہ تھا، اس نے منصوبہ بنایا کہ بغداد میں عباسی خلافت ختم کر کے شیعی خلافت قائم کی جائے۔ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ تاتاریوں کا سردار اعظم چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں ہی ایسا شخص ہے جو بغداد کو شکست دے سکتا ہے، اس نے ہلاکو سے خط و کتاب شروع کی، جس میں بغداد کی دولت وثروت کا مبالغہ آمیز تذکرہ کر کے حملے کی دعوت دی اور اسے بھرپور تعاون کا یقین دلایا، اس کے علاوہ بغداد کے شیعوں سے بھی اس مضمون کے خطوط لکھوائے کہ ہماری مذہبی کتابوں میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ فلاں سنہ میں ایک تاتاری سردار بغداد پر قبضہ کرے گا، ہمیں یقین ہے کہ وہ سردار آپ ہی ہیں، اس لئے ہم پیشگی آپ سے اپنی جان و مال کی امان چاہتے ہیں۔''

ہلاکو کو جب ابن العلقمی کا خط ملا تو اس نے قاصد سے کہا کہ ابن العلقمی جو وعدہ کرتا ہے اس کی مکمل ضمانت اس خط میں موجود نہیں ہے، کیوں کہ اب بھی بغداد فوجوں سے بھرا ہوا ہے، ابن العلقمی کو جب یہ جواب پہنچا تو اس نے اس کی بھی تدبیر نکالی، خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ملکی محاصل کی کمی کی شکایت کر کے اس نے فوج میں تخفیف کی تجویز رکھی، جو منظور کر لی گئی۔ اس نے فوجوں کی بڑی تعداد موقوف کر دی اور باقی ماندہ کو سرحدوں کی نگرانی کے بہانے منتشر کر کے ہلاکو کو خط لکھا کہ اب بغداد خالی ہو چکا ہے، حسب وعدہ عباسی دارالخلافہ میں آپ کا استقبال ہے۔ ہلاکو نے بلاتوقف بغداد پر حملہ کر دیا، نہتے عوام نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور پچاس روز تک شہر میں گھسنے نہیں دیا، لیکن تابکے، بالآخر تاتاری افواج شہر میں داخل ہو گئیں اور وہ قتل عام مچایا کہ ہلاکو کے دادا چنگیز کی روح بھی شرما گئی، سب سے پہلے علماء، فقہاء اور اراکین سلطنت کو تہہ تیغ کیا گیا، بعد ازاں عوام کو کھیرے اور ککڑی کی طرح کاٹا گیا، مقتولین کی کثرت سے فصیل کی خندقیں اور کنویں پٹ گئے، جو بچے وہ وباؤں کی نذر ہو گئے، ایک اندازے کے مطابق ایک کروڑ چھیالیس لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوئیں، سب سے بڑا نقصان علمی ذخائر کا ہوا، نادرۂ روزگار لائبریری ''بیت الحکمۃ'' اور دیگر کتب خانوں کی کتابیں وسیع وعریض دجلہ کا پل بنانے کے لئے استعمال کی گئیں، کچھ دنوں کے لئے دریا کا بہاؤ رک گیا اور مدتوں اس کا پانی مخطوطات کی روشنائی سے سیاہ نظر آتا رہا۔ خلیفہ کا حشر سب سے برا ہوا، ابن العلقمی کے کہنے پر ہلاکو نے اس کو زندہ بوری میں بند کر کے لاتوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے ریزہ ریزہ کر دیا، اس طرح ۶۵۶ھ میں خلافتِ عباسیہ کا بغداد سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا، اسلامی دارالخلافہ کی یہ تباہی اتنی کامل اور مکمل تھی کہ سعدی شیرازی جیسا باغ و بہار شخص بھی یہ کہہ کر رو پڑا کہ:

آسماں راحق بود گر خوں ببارد برزمیں ☆ برزوال ملک مستعصم امیر المؤمنین

✦.....❖.....✦

حضرت عثمان ذی النورین رضؓ

فضائل وکمالات، مآثر وخدمات، محصوری وشہادت

❖ مولانا عبدالرشید بستوی
مدرّس حدیث شریف، جامعہ ہٰذا

ولادت، نسب، خد و خال : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن: بیضاء بنت عبدالمطلب کے صاحب زادے، بنوامیہ کے گل سرسبد، جود وسخا میں یکتائے روزگار، حلیم و بردبار، کنواری لڑکیوں سے زیادہ باحیا اور شرمیلے، میانہ قد، خوب رو، سینہ چوڑا اور رنگ سرخی مائل سفید تھا، اس وقت پورے مکہ مکرمہ میں آپ سے زیادہ خوش شکل کوئی دوسرا نہ تھا۔

عام الفیل کے چھ سال بعد عفان بن ابوالعاص بن امیہ بن عبدشمس قرشی اموی کے یہاں ولادت ہوئی، قدیم قبائلی دستور کے مطابق بنو ہاشم کے بڑے بوڑھوں نے آپ کا نام عثمان تجویز کیا۔

فضائل و کمالات : حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے ابتدائی دنوں میں ہی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مساعی جمیلہ اور دعوت وتحریک کے نتیجہ میں حلقۂ بگوش اسلام ہوئے۔ چچا حکم بن ابوالعاص نے ہر ممکن طریقہ پر آپ کو راہِ اسلام سے ہٹانے کی کوشش کی، مگر آپ ہمالہ کی مانند ثابت قدم رہے، بالآخر چچا ہی تھک ہار کر بیٹھ جانے پر مجبور ہوئے۔

تاریخی ہجرت : اہل مکہ کی ستم رانیوں سے تنگ، مسلمان بلادِ حرم چھوڑ کر گوشۂ عافیت کی تلاش میں دور دراز علاقہ حبشہ جانے کے لئے تیار، اس اولین ہجرت کے اولین راہ رو یہی حضرت عثمان بن عفانؓ تھے۔ سعادت و فضیلت کی انتہاء کہ دنیائے گیتی میں حضرت لوط علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد ایسے دوسرے فردِ فرید، جنہوں نے محض دین وایمان کی حفاظت کی غرض سے مع اہل وعیال، گھر بار چھوڑ کر اجنبی علاقے کا رخ کیا۔ **فرضی اللّٰہ عنہ وارضاہ** ۔

ذی النورین : یہ تاجِ عظمت بھی، دنیا کی تاریخ میں صرف حضرت عثمان غنی کے سر سجا کہ ایک نبی کی دو دو صاحب زادیاں یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں۔ پہلے حضرت رقیہ سے حضرت عثمانؓ کا نکاح ہوا، پھر جب بدر کے موقع پر ان کی وفات ہوگئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ کو

آپ کی زوجیت میں دے دیا۔ سن ۹ھ میں حضرت ام کلثوم کی وفات پر فرمایا: اگر میری تیسری لڑکی ہوتی تو اس کی شادی بھی عثمانؓ سے کر دیتا۔ ذی النورین کے لقب سے آپ اسی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

امتیازات و خصوصیات : زبانِ رسالت سے حضرت عثمان کو جنت کی بشارت دی گئی، زندگی میں شہادت کی موت کی نوید پائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارۂ چشم پا کر مدینہ منورہ کا شیریں کنواں ''بئر رومہ'' ذاتی مصارف سے خرید کر عام اہل اسلام کے لئے وقف کیا، جیش عسرہ [غزوۂ تبوک] کے لئے لشکر کی ترتیب و تیاری، سامان حرب وضرب کی فراہمی، میں سب پر سبقت لے گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مغفرت کی نوید پائی، حضور کے دست نبوت پر بیعتِ ایمان کرنے کے بعد سے تاعمر دائیں ہاتھ سے کبھی شرم گاہ نہ چھوئی، قبولِ اسلام کے بعد معمولاً ہر جمعہ کو ایک غلام باندی آزاد کرتے رہے۔ زمانۂ جاہلیت میں نہ کبھی بدکاری کا ارتکاب کیا اور نہ ہی چوری کا۔ علاوہ ازیں یہ ان معدودے چند صحابہ کرام میں سے ایک تھے جو عہدِ نبوی میں پورے قرآن کریم کے حفظ کی دولت سے مالا مال ہوئے، نیز یہ کہ اسلامی مملکت کی وسعت کے باعث تلاوتِ قرآن میں اسلوب ادا اور بعض حروف کے تلفظ میں قبائلی اختلاف کے سبب، رونما ہونے والے اختلافات کو ختم کر کے، ساری امت کو قریش کے اسلوب ولہجہ پر آپ ہی نے یکجا کیا۔ بہ قول علامہ جلال الدین سیوطیؒ خلفائے اسلام کی تاریخ میں [اس میں بنوعباس اور بنوامیہ کے خلفاء بھی شامل ہیں] پورے قرآن کریم کے حافظ حضرت عثمان غنی اور دوسرے خلیفہ ہارون عباسی ہوئے۔

خلافت و امارت : حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنی آخری حیات میں نام زد کردہ چھ حضرات صحابہ کرامؓ کی مشاورت، دیگر کبارِ صحابہؓ کی تائید وحمایت کے بعد، حضرت عثمان غنیؓ ۲۴ھ کے اواخر یا ۲۵ھ کے اوائل میں خلیفہ وامیر المؤمنین منتخب ہوئے۔ خلافت کے بارگراں کے تصور سے لرزہ براندام، اپنا پہلا خطبہ نہ دے سکے اور منبر سے نیچے اتر آئے۔ مدتِ خلافت بارہ سال پر محیط رہی اور عمر شریف اسّی ۸۰/سال سے زیادہ ہوئی۔

کچھ کارھائے نمایاں : شرکائے بدر واحد وصلح حدیبیہ حضرات صحابہ کرامؓ اور ان میں شہادت سے سرفراز اصحابِ نبی کے خانوادوں کے لئے وسیع اراضی اور جاگیریں الاٹ کیں، اس طرح حضرت عثمان غنیؓ نے ان کی بے مثال خدمات اور لازوال قربانیوں کو خراج تحسین پیش کر کے ایک اچھی روایت کا آغاز کیا اور اس طرح کے خانوادوں کے حوالے سے معاشی تنگی اور فقر وتنگ دستی کے روح فرسا حالات پر قدغن لگایا۔ حکومت کے مویشیوں کے لئے ہر مرکزی بستی اور شہر سے متصل چراگاہیں چھوڑیں تاکہ ان کے چارہ کے بندوبست میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مدینہ منورہ کی آبادی کے پھیلاؤ کے پیش نظر، مسجد نبوی کی شاندار توسیع کی اور اس مقصد کے لئے مسجد سے متصل مکانات بازار سے زیادہ قیمت پر خرید کر شامل توسیع کیا۔ توسیع میں منقش پتھر لگوائے، ستون جو لکڑی کے تھے، انہیں پتھر کے ستونوں سے بدل دیا تاکہ آگ سے محفوظ رہیں، جب کہ چھت

میں سال کی بیش قیمت لکڑیاں لگوائیں، جن کی لمبائی ایک سو ساٹھ گز اور چوڑائی ڈیڑھ سو گز تھی۔ عام اہل اسلام کے سالانہ وظائف میں حضرت عمر بن خطاب کے عہد کی بہ نسبت کئی گنا اضافہ کیا، جس سے ہر طرف خوش حالی و فارغ البالی نظر آنے لگی اور چوری وڈکیتی کے واقعات تقریباً زیرو سطح پر آ گئے۔ مسجد نبوی اور دیگر مساجد کے لئے باضابطہ تنخواہ دار مؤذنین متعین کئے، معلمین واساتذہ، نیز امراء اور دیگر حکومتی اہل کاروں کے مشاہرے دوچند کر دیئے کہ رشوت خوری راہ نہ پا سکے۔ عہد عمری سے قائم پولیس محکمہ میں بعض مفید اصلاحات کیں اور ہر مرکزی علاقے کے لئے پولیس کا ایک سربراہ اور کوتوال متعین کیا، تاکہ ایک ذمہ دار کے ماتحت نظم وضبط کے ساتھ یہ محکمہ بہتر کام کر سکے۔

صلہ رحمی و بردباری : قبولِ اسلام سے پہلے ہی، حضرت عثمان کی ہمدردی، غم گساری، غریب پروری، بالخصوص اہل خاندان اور تنگ دست رشتہ داروں کی خبر گیری مشہور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام سے ہزار عناد اور دشمنی کے باوجود اشرافِ مکہ نے حضرت عثمان سے کچھ زیادہ تعرض نہ کیا اور نہ ان کی ہجرتِ حبشہ یا ہجرتِ مدینہ کے موقع پر کسی قسم کی قابلِ ذکر مزاحمت کی۔

حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد ان کی یہ انسانیت نوازی دوچند ہوگئی۔ مزاج میں تحمل، صبر وضبط کے پیکر، عفو ودرگزر ان کا وطیرہ، ضرورت مندوں اور حرماں نصیبوں کی غم خواری شیوہ۔ خاص طور پر اہل خاندان کے لئے بے انتہا کشادہ دست، ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی۔ حیا ایسی کہ فرشتے بھی ان سے شرم کرتے۔ بعض اوقات ضروری تنبیہ کرتے ہوئے الفاظ کے انتخاب میں بڑی دشواری محسوس کرتے اور زجر وتوبیخ میں قصوروار کی سبکی کا احساس دامن گیر ہو جایا کرتا۔

مروان بن حکم کی عیاری : مروان بن حکم نہ صرف پورے بنوامیہ میں اپنی ذکاوت وذہانت، زیرکی و دانش مندی، پیش بینی و چالاکی میں مشہور ومعروف تھا، بلکہ اس کے حسنِ انتظام کی صلاحیت کے بھی لوگ مداح۔ لیکن تاریخی واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ آج کل کے کسی شاطر سیاست داں کی مانند ہر داؤ پیچ کا ماہر کھلاڑی تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ کا حقیقی چچازاد بھائی۔ اس کی ذکاوت اور انتظامی صلاحیت کے سبب، حضرت عثمانؓ نے اس کو میر منشی [چیف سکریٹری] کے طور پر تعینات کر لیا۔ شروع میں اس نے بڑی تندہی، محنت اور لگن سے امور حکومت انجام دیئے۔ اس طرح وہ بہ تدریج حضرت عثمانؓ کا سب سے زیادہ معتمد ومقرب بن کر نظامِ مملکت پر حاوی ہو گیا۔

امرائے بنو امیہ : اس نے کمال دانش مندی سے کام لیتے ہوئے حضرت عثمان کے اعتماد وتقرب اور قریبی رشتہ کا فائدہ اٹھایا، اہم صوبوں اور مرکزی علاقوں کے حکام وامراء اور گورنر بنوامیہ میں سے نام زد کرائے۔ مثلاً فلسطین، لبنان سمیت پورے ملک شام کے حاکم وگورنر حضرت امیر معاویہ تھے جو پہلے سے ہی اس منصب پر فائز چلے آ رہے تھے۔ بصرہ میں سعید بن عاص اموی، مصر میں عبداللہ بن سعید بن ابوسرح اموی اور خراسان میں عبداللہ بن عامر اموی۔

مروان کی حیثیت : اگر گا ہے ان گورنروں کی کوئی شکایت دارالخلافہ آتی تو اولاً مروان اسے حضرت عثمان غنی تک پہنچنے نہ دیتا اور پہنچ جانے کی صورت میں، بہ لطائف حیل ان حکام وامراء کی بے گناہی، حسنِ کارکردگی اور رعایا پروری کی کہانیاں سنا کر حضرت عثمانؓ کو مطمئن کر دیتا۔ بات اگر زیادہ خراب ہوتی تو حضرت عثمان کو معزولی و معطّلی کے بجائے ان اہل کاروں کے تبادلے کے فیصلے پر قائل کر لیتا۔ مروان کی اس طرح سے جا و بے جا اموی حکام کی حمایت و پشت پناہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں کے گورنر، مروان کے زبردست حامی اور اس کے اشارۂ چشم پر کچھ بھی کر گذرنے کو تیار۔ اس حوالہ سے حضرت امیر معاویہؓ کا استثناء کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر اپنے حسنِ عمل اور حسنِ انتظام کے باعث خود بڑے مضبوط تھے اور انہیں مروان یا کسی شخص کی پشت پناہی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مروان کا خطرناک کھیل : گورنر مصر عبداللہ بن ابوسرح سے، وہاں کے لوگوں کو زیادہ شکایتیں تھیں، اس کی عادت ٹھیک نہ تھی، انصاف وعدل گستری کے بجائے ظلم و جبر روا رکھتا تھا۔ اہل مصر نے اس کی یہ شکایتیں حضرت عثمانؓ تک دارالخلافہ پہنچائیں۔ آپ نے اس کے نام ایک سخت تہدیدی تحریر ارسال کی، مگر اس نے اس پر کان نہ دھرا، بلکہ شکایت کرنے والوں کو اس قدر مارا پیٹا کہ ان میں سے ایک شخص زندگی کی جنگ ہار گیا۔ اب تو مصر میں حالات پہلے سے زیادہ ناگفتہ بہ ہو گئے اور گورنر کے خلاف بغاوت کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ سات سو افراد پر مشتمل ایک عظیم وفد مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ اس نے گورنر مصر کی چیرہ دستیوں کی داستانیں حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ سمیت متعدد کبار صحابہ کو سنائیں اور خود خلیفۃ المسلمین سے اس حوالے سے ملاقاتیں کیں۔ حضرت عثمان غنیؓ نے ان حضرات صحابہؓ کے اصرار پر عبداللہ بن ابوسرح کو معزول کر اس کی جگہ نئے امیر کے تقرر پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اہل مصر کے کہنے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صحابہ زادے محمد بن ابوبکر کو نیا امیر مقرر فرمایا اور گورنر کے نام اس کی معزولی، محمد بن ابوبکر کے حق میں اختیارات سے دست برداری اور ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرنے جیسی ہدایات پر مشتمل ایک خط لکھوا کر، مہر بند محمد بن ابوبکر کے سپرد کر دیا۔ چناں چہ ان سات سو مصریوں، نیز مہاجر و انصار کی ایک تعداد کے ساتھ وہ عازم مصر ہو گئے۔

عبداللہ بن ابوسرح کی معزولی، کہیں دوسرے اموی گورنروں کی بے دخلی کا نقطۂ آغاز نہ ثابت ہو، اس کے سد باب اور مخالفین و شکایت کنندگان کو نشان عبرت بنا دینے کے جذبہ سے، مروان نے عبداللہ بن ابوسرح کے نام دوسرا خط، حضرت عثمان کے فرضی دستخط اور مہر کے ساتھ تحریر کر، حضرت عثمان ہی کے غلام کو ان ہی کی تیز رفتار اونٹنی پر مصر روانہ کیا اور تاکید کی کہ وہ محمد بن ابوبکر اور ان کے رفقاء سے پہلے مصر پہنچ جائے۔ مگر ابھی اس قافلہ نے دو ہی منزلیں طے کی تھیں کہ یہ شتر سوار پکڑا گیا اور وہ خط بھی اس سے برآمد کر لیا گیا۔ خط پڑھتے ہی محمد بن ابوبکر اور ان کے رفقاء دم بخود رہ گئے اور یہ یقین کر بیٹھے کہ حضرت عثمان نے بہت خوب صورتی سے ہم سب کے قتل کی سازش کی

ہے۔غصہ میں بھرا ہوا قافلہ وہیں سے واپس مدینہ ہوگیا۔ یہاں انہی اکابر صحابہ کو وہ خط دکھایا گیا، سب محو حیرت۔ انہوں نے حضرت عثمان سے ملاقات کی اور دریافت کیا خط آپ نے لکھوایا ہے؟ فرمایا نہیں۔ یہ غلام آپ کا ہے؟ فرمایا ہاں! اونٹنی کس کی ہے؟ میری۔ دستخط کس کے ہیں؟ بہ ظاہر میرے۔ مہر کس کی ہے؟ میری۔ اس سے حضرات صحابہ کرامؓ تو مطمئن ہوگئے کہ حضرت عثمان کا یہ خط نہیں ہے اور نہ وہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت کر سکتے ہیں، لیکن باشندگانِ مصر، قبیلۂ ہذیل سے تعلق رکھنے والے حامیان محمد بن ابوبکر کا اصرار کہ یہ خط حضرت عثمان ہی کا ہے۔ اگر ان کا نہیں تو دوسرا شخص جو یہ کام کرسکتا ہے وہ مروان ہے، اسے ہمارے حوالے کیا جائے۔ دوسرے صحابہ کرامؓ بھی اس حق میں تھے کہ یہ حرکت مروان کی ہی ہوسکتی ہے، لہٰذا اسے برخاست کر محمد بن ابوبکر کے حوالے کر دیا جائے۔

نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن : حضرت عثمانؓ کے لئے نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن کی صورتِ حال تھی۔ نہ وہ یہ یقین کر سکتے تھے کہ مروان ان کے نام پر اور ان کے فرمان کے خلاف اس طرح کی گھناؤنی حرکت کرسکتا ہے اور نہ اسے ان باغیوں کے حوالے کرنے پر آمادہ کہ ان کی نظر میں مروان بہ ظاہر بے قصور تھا۔ محمد بن ابوبکر کے حامیوں کی تعداد روز افزوں تھی۔ حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا گیا، جو تقریباً ایک مہینہ جاری رہا۔ حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے تھے۔ باغی مسلح دروازے پر بھی کھڑے تھے، لہٰذا اشیائے خورد ونوش کی قلت پیدا ہوگئی۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت علی نے حضرات حسنین کو، نیز حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے صاحب زادوں کو دروازے پر مامور کیا کہ نہ گھر میں کوئی باغی گھس کر نامناسب حرکت کر سکے اور نہ ہی کھانے پینے کا سامان اندر جانے سے روکا جاسکے۔ حفاظت کے دوران یہ صاحب زادگان کئی بار باغیوں کے تیر سے زخمی بھی ہوئے۔

مروان بھی حضرت عثمانؓ کے گھر میں بالائی منزل پر اپنے چند اہل خانہ کے ساتھ مقیم تھا۔ حضرت عثمان اور دیگر اہل خانہ نچلے حصہ میں رہائش پذیر۔ محمد بن ابوبکر اپنے دو مصری مسلح حامیوں کے ساتھ مکان کے عقبی حصہ سے سیڑھی لگا کر چھت پر گئے اور وہاں سے نیچے اتر کر حضرت عثمان تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ مروان کو نہ دیکھ سکے۔ ان کو گھر کے اندر جاتا دیکھ مروان خاموشی سے اترا اور دروازے کی راہ سے بھاگ نکلا۔ اس طرح وہ اپنے محسن اعظم اور تایازاد بھائی امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں، قتل ہونے کے لئے بے یار ومددگار چھوڑ گیا۔

اسلام کی چکی اپنی جگہ سے ہٹ گئی : محمد بن ابوبکر تو پیچھے ہٹ گئے، مگر ان کے ساتھیوں نے عین اس وقت حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا جب وہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور یہ آیت سامنے تھی "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم" عنقریب اللہ ان کے لئے کافی ہوجائے گا اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ یہ عید الاضحیٰ کا مہینہ، تکبیر تشریق کے دن، نمازِ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ ہجری سال ۳۵ھ تھا۔ اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی کہ "اسلام کی چکی ۳۵ رسال کے بعد اپنی جگہ سے ہٹ جائے گی" [مستدرک حاکم] یہ چکی تھے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ۔

پھر خون مسلم کی یہ ارزانی : امام اہل سنت و جماعت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی سنگینی کی بابت رقم طراز ہیں'' آپ کی شہادت بہ لحاظ اپنی مظلومیت اور مصیبت کے اور بہ لحاظ ان نتائج وفتن کے جو اس شہادت سے پیش آئے، اس امت میں سب سے پہلی اور بے نظیر شہادت ہے۔ مسلمان باہم متحد اور متفق تھے اور سب کی متفقہ قوت، کفر اور شعائر کفر کے فنا کرنے میں صرف ہو رہی تھی اور برکاتِ نبوت موجود تھیں، مگر حضرت عثمان کا شہید ہونا تھا کہ وہ برکات ان سے لے لی گئیں اور باہم اختلاف پیدا ہو گیا اور وہی تلوار جو کافروں کے قتل کے لئے تھی، اب آپس میں چلنے لگی۔ اُس وقت سے آج تک پھر اگلا سا اتفاق مسلمانوں کو نصیب نہیں ہوا بلکہ روز بہ روز اختلاف وافتراق کا دائرہ وسیع ہی ہوتا گیا۔'' [سیرت خلفائے راشدین]

یہ قمیص مت اتارنا : حضرت عثمان نے ظلماً اور ناحق قتل ہو جانا گوارہ کر لیا، مگر اپنی بے گناہی کے باعث نہ خلافت سے دست بردار ہوئے اور نہ ہی اپنے حامیوں کو ان باغیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی کہ مبادا مدینۃ الرسول کے گلی کوچے خونِ مسلم سے سرخ نہ ہو جائیں۔ ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا'' عثمان! اللہ تم کو ایک قمیص پہنائے گا، اگر لوگ اس کو اتارنا چاہیں تو تم مت اتارنا۔'' [ترمذی شریف] اس کے باعث نہایت بے کسی اور مظلومیت کی حالت میں جامِ شہادت نوش کر لیا۔ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس حضرات صحابہ کرام کو بہ یک وقت جنت کی بشارت دی۔ [اسی وجہ سے ان کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے] جب حضرت عثمانؓ کی باری آئی تو فرمایا ان کو خوش خبری ہو جنت کی ان پر آنے والی مصیبت کے سبب۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت عثمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا'' اس فتنہ میں یہ ظلماً قتل کئے جائیں گے۔''

ایک روایت ہے کہ کسی نبی کی شہادت ستّر ہزار افراد کی جان لیتی ہے اور ایک خلیفۂ برحق کی پینتیس ہزار افراد کی۔ اب تک امت جانے کتنے پینتیس ہزار افراد کی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکی ہے، مگر حساب ہے کہ چکتا ہی نہیں اور امت ہے کہ اس کی حرماں نصیبی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل! وقت دعا ہے ☆ امت پہ تری آ کے برا وقت پڑا ہے

فرضی اللّٰہ عنہ و أرضاہ یوم القیامۃ

✦.....❖.....✦

۱-اس مضمون کی ترتیب میں معاون کتابیں درج ذیل ہیں:

۱-صحاحِ ستہ۔ ۲-تاریخ الخلفاء، علامہ سیوطیؒ۔ ۳-مستدرک حاکم۔ ۴-الاصابہ، حافظ عسقلانیؒ۔ ۵-مشکاۃ المصابیح۔ ۶-عثمان ذی النورین، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ۔ ۷-سیرت خلفائے راشدین، مولانا عبدالشکور فاروقیؒ۔

حضرت مولانا وکیل احمد شیروانی

جوارِ رحمت میں

❖ محمد قاسم لوہاروی/، قصبہ گنگوہ/ضلع سہارن پور

ممتاز عالم دین، مشہور بزرگ اور سلسلۂ تھانوی کے چشم و چراغ مسیح الامت حضرت جلال آبادیؒ کے داماد و خلیفہ، مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کے صدر، ''ماہنامہ الصیانہ لاہور'' کے مدیر، معروف دینی درسگاہ جامعہ اشرفیہ لاہور پاکستان کے استاذ حدیث و نائب مفتی، دارالعلوم کراچی کے سرپرست: حضرت مولانا وکیل احمد شیروانی مختصر علالت کے بعد ۱۷/جنوری ۲۰۱۶ء بروز اتوار صبح ۵/بجے لاہور میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! حضرت مولانا وکیل احمد شیروانی کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں مجدد زمانہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مکان تھانہ بھون میں ہوئی، جہاں آپ کے والد محترم حضرت تھانویؒ کے معتمد، خادم و خلیفہ حضرت مولانا جلیل احمد خان شیروانی قیام پذیر تھے۔ واضح رہے کہ مولانا جلیل احمد خان شیروانی مسیح الامت حضرت جلال آبادیؒ کے بہنوئی اور آپ کے وطن سرائے برلہ علی گڑھ کے نواب اور رئیس تھے اور حضرت تھانویؒ کے یہاں تقریباً ۱۸/سال خادمانہ طور پر مقیم رہے۔

حضرت تھانویؒ نے ''وکیل احمد'' نام تجویز فرما کر اذان و اقامت اور تحنیک بھی اپنے دستِ مبارک سے فرمائی۔ ابتدائی تعلیم خانقاہ میں ہوئی، ابھی آپ کی عمر ۸/سال تھی کہ جولائی ۱۹۴۳ء میں حضرت تھانویؒ کی وفات ہوگئی تو آپ اپنے والد محترم کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو آپ کے والد محترم بھی حضرت تھانویؒ کے کے اکثر خلفاء کے ساتھ اپنا اثاثہ چھوڑ کر لاہور منتقل ہوگئے اور حضرت تھانویؒ کی قائم کردہ مجلس صیانۃ المسلمین جس کو حضرت تھانویؒ نے ۱۹۳۰ء میں تھانہ بھون میں قائم فرما کر اس کی ذمہ داری آپ کے حوالے کی تھی، آپ نے اس کی نشاۃ ثانیہ زیر سرپرستی حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری بانی و مہتمم جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد، لاہور میں فرمائی اور تادم آخر حضرت تھانویؒ کے اصول و منشاء کے مطابق اس کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔

مولانا وکیل احمد خاں شیروانی نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں درسِ نظامی کی تکمیل کی، بخاری شریف حضرت

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ سے پڑھی، دورۂ حدیث کے دیگر اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ خلیفہ حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ اور مولانا غلام رسول ہزارویؒ جیسے جید علماء سے کسب فیض کیا اور فراغت کے بعد آپ کی صلاحیت کو دیکھ کر اربابِ انتظام نے آپ کو جامعہ اشرفیہ میں عربی مدرس رکھ لیا، جہاں آپ نے ابتداء سے لے کر حدیث شریف کا سبق بہت ہی محققانہ انداز میں دیا اور دارالافتاء کی نیابت کی ذمہ داری خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ مدرسی کے زمانے میں ہی آپ نے اپنا اصلاحی تعلق عارف باللہ مسیح الامت حضرت جلال آبادیؒ سے قائم کرلیا تھا، آپ کے حالات پر مطلع ہوکر ایک موقع پر حضرت جلال آبادیؒ نے فرمایا تھا، مگن میاں (حضرت پیار سے مگن میاں فرماتے تھے) ماشاءاللہ سلوک میں اس مقام پر ہیں جہاں سالک بہت دیر میں پہنچتا ہے، اس لئے حضرت نے آپ کو اجازت بیعت سے نوازا اور تادمِ آخر ہر اتوار کو بعد ظہر ان کے یہاں مجلس کا اہتمام ہوتا اور قرب وجوار سے اہل طلب شریک ہوکر خوب خوب استفادہ کرتے رہے۔

اسی کے ساتھ آپ کے دورِ انتظام میں ''مجلس صیانۃ المسلمین'' کے کاموں میں خوب وسعت ہوئی اور الحمدللہ ملک کے اکثر حصوں میں اس کی شاخیں حضرات علماء کرام وذمہ دارانِ مدارس سے وابستہ حضرات کی نگرانی میں قائم ہوگئیں۔ الحمدللہ مولانا وکیل احمد شیروانیؒ کے زمانہ میں مجلس صیانۃ المسلمین لاہور کا تین روزہ اجتماع بھی پابندی سے ہوتا تھا، جس میں حضرت تھانویؒ سے وابستہ پاک وہند کے حضرات اکابر علماء بڑے اہتمام سے شریک ہوتے اور یہ یادگار اجتماع تین یوم اپنے بزرگوں سے خوب خوب استفادہ کرتا۔ مولانا مرحوم کی تواضع کا یہ حال ہوتا کہ ہندوستان سے جو حضراتِ اکابر اجتماع میں تشریف لے جاتے، آپ اپنی تمام ذمہ داری ومشغولی کے باوجود لاہور ایئرپورٹ واسٹیشن پر اپنی مجلس کے رفقاء کے ساتھ موجود ہوتے اور نہایت خندہ پیشانی سے ہر ایک کا خیر مقدم کرتے، اپنی گاڑیوں کے ساتھ ان تمام مہمانوں کو اپنے ذاتی مکان میں ٹھہراتے اور خوب خوب ضیافت فرماتے اور مہمانوں کی ہر طرح کے راحت وآرام کا خیال فرماتے۔ اسی طرح عرصۂ دراز سے مجلس کے لئے ایک کشادہ جگہ کی ضرورت تھی، جو الحمدللہ ان کے اخلاص کی برکت سے تقریباً پندرہ سال قبل ایک کشادہ زمین ملتان چنگی نئی آبادی میں دستیاب ہوگئی تھی اور مجلس کا دفتر اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوگیا تھا۔ جس میں الحمدللہ ایک مدرسہ صیانۃ العلوم کے نام سے قائم ہے، جس میں حفظ وناظرہ کے ساتھ عربی چہارم کے سینکڑوں طلبہ قیام وطعام کے ساتھ مقیم ہیں اور ایک اسپتال بھی قائم ہے جہاں قرب وجوار کی آبادی اور غریب لوگوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا کی ساٹھ سالہ زندگی دین مبین کی ترویج واشاعت میں صرف ہوئی اور بڑی نیک نامی کے ساتھ آپ نے حضرت تھانویؒ کے اصول پر رہتے ہوئے اپنے شیخ ومربی حضرت جلال آبادیؒ کے فیض کو بہت عام کیا۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین

✦.....❖.....✦

(پہلی قسط)

دیوبند کے دو سپوت

❖ ڈاکٹر عبید اقبال عاصم / علی گڑھ

تحریک ریشمی رومال کے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے خاص رفقاء میں جو فی الحقیقت ان کے رازوں کے امین اور ان کے مشن سے خفیہ طور پر وابستہ تھے ان میں سے ایک منشی مہدی حسن مرحوم تھے، شیخ الہند کی انگریزی زبان میں خط و کتابت کی تمام تر ذمہ داری منشی مہدی حسن مرحوم کے ہی ذمے تھی۔ شروع میں ایک اسکول میں فارسی کے استاد تھے لیکن بعد میں روزگار کا ذریعہ دستاویز نویسی کو بنالیا تھا۔

دیوبند کی منصفی عدالت میں عرائض نویس منشی مہدی حسن کو اللہ تعالی نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا ان کی ایک خوبی تو یہ تھی کہ وہ دیوبند کے شیوخ و سادات کی سکنی جائیداد کے تقریباً حافظ شمار کئے جاتے تھے تقسیم ملک کے بعد تو انہیں یہ ملکہ بھی حاصل ہو گیا تھا کہ کس مکان کا کتنا حصہ کس کا ہے؟ کسٹوڈین سے اسے کس طرح واگزار کرانا ہے، کس کے نام کرانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی متنازعہ جائیداد کی خرید و فروخت کا ذمہ انہیں کے کاندھوں پر رہا۔ بسا اوقات اس میں انکے اپنے قریبی شمار کئے جانے والے افراد بھی زد میں آئے۔ لیکن انہوں نے اسکی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان کا ایک اور وصف دستاویز نویسی تھا۔ صحرائی و سکنائی جائیداد کے سرکاری دستاویزات میں الفاظ کی ایسی بندش جو قانون کی گرفت میں ہی نہ آسکے ان کے بائیں ہاتھ کا شبانہ روز کا کھیل تھا۔ اس چکر میں ان کی زندگی کے بیشتر اوقات ان کے ہاتھ میں مقید تھیلے میں محفوظ ان کاغذات کے مطالعہ کی نذر ہوتے جو بے مکان مکینوں کو گھر کی آسائش مہیّا کرنے میں معاون ہوتے، اس میں ان کی فطری ذہانت و فطانت کا بڑا دخل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت عدلیہ میں بڑے بڑے صاحب عدل و انصاف جج حضرات صرف یہ سن کر کہ منشی مہدی حسن کی تحریر ہے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے تیار ہو جاتے۔

منشی مہدی حسن کے یہ تو ذاتی اوصاف تھے اللہ ان کی حسنات کو قبولیت اور سیئات سے درگزر فرمائے۔ آمین، ان سب پر مستزاد ان کے وہ دو صلبی جواہر پارے تھے جو اپنی زندگی میں اپنی شکل و شبیہ، حلیہ، وضع قطع اور رکھ رکھاؤ کے عارضی تام جھام نہ رکھنے کے باعث کبھی قابل التفات نہ رہے۔ لیکن ان کی طبعی صلاحیتوں اور قدرتی ذہانت

کے مالا مال ہونے کے باعث انہوں نے اپنی حیات میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور مرنے کے بعد بھی ان کے نقوش دیوبند کی ادبی وتہذیبی تاریخ پر مرتسم رہے یہ دونوں بھائی جمیل مہدی اور عقیل مہدی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ دونوں بھائیوں میں ایک وصف مشترک تھا مروجہ نصابی تعلیم سے محرومی، اسکے باوجود جمیل صاحب مرحوم کی دنیا ومافیہا کی عالمانہ معلومات ان پر سیر حاصل بحث ومباحثہ اور تسلی وتشفی بخش تبصرہ، ملت کی نبض شناسی اور اس کا مناسب علاج، بے خوف اظہار رائے اور بے باک انداز تحریر کے باعث اردو کی نثری اصناف بالخصوص صحافت پر مضبوط گرفت اور چھوٹے بھائی کی نظم کی جملہ اصناف پر مہارت تامہ۔

عقیل محزوں مرحوم جو محزوںؔ اور نیازیؔ دونوں ہی تخلص رکھتے تھے ان کا شعری ذوق بہت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اللہ نے ذہانت ایسی عطا کی تھی کہ نظم کی کوئی بھی صنف ہو منٹوں میں جذبات واحساسات کو پرشکوہ الفاظ میں اس طرح پرو دیتے کہ وہ بھاری بھرکم مالا لگتی۔

جمیل مہدی مرحوم بڑے تھے اور عقیل مہدی چھوٹے، دونوں بھائی میرے والد محترم کے دوستوں میں تھے۔ بہت سے اشتراکات کے باوجود دونوں بھائیوں میں کچھ تضادات بھی پائے جاتے تھے۔ مثلاً جمیل صاحب مرحوم بے تکان بولنے والے اور عقیل صاحب مرحوم واجبی سے بھی کم بات کرنے والے۔ جمیل صاحب کی بہت سی بیٹھکیں اور عقیل صاحب کی بیٹھک بیشتر ایک دوکان تک محدود تھی جو ایک قصاب اختر کے نام سے جامع مسجد کے قریب واقع تھی اس دوکان پر منھ کے ذائقہ کے لئے گوشت تو بکتا ہی تھا اسی کے ساتھ چند بے فکروں کی نشست گاہ بھی تھی جو اپنے دل چسپ تبصروں سے دل ودماغ کو تازگی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ اختر کی دوکان پر ایسے بہت سے حضرات کے ساتھ مرحوم بھی آکر بیٹھ جاتے، تمام گاہک آتے چلے جاتے اور یہ حضرت گوشت سے زیادہ ان آنے والوں پر متوجہ ہوتے جو ان کے جوڑی بند ہوتے۔ روزانہ قصائی کی دوکان پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں سننا اور کبھی کسی بات پر معقول پھبتی کسنا، یا مسکت جواب دینا عقیل صاحب مرحوم کے معمولات میں سے تھا۔ دس گیارہ بجے وہاں سے گوشت لیکر رخصت ہوتے تو راستہ میں دو تین ٹھکانے ایسے ہوتے جہاں کھڑے ہوکر بیڑی کے کش لگاتے، اسی درمیان میں برسر راہ کوئی سہرے یا رخصتی کی فرمائش کر دیتا تو اس کو پورا کرنے کے لئے فرمائش کنندہ کے گھر جا کر یا اس کو اپنے گھر لیجا کر تعمیل حکم کر دیتے۔

دونوں بھائیوں کی خوبی یا خامی یہ بھی تھی کہ وہ نہ تو ''ایاز قدر خود بہ شناس'' کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے اپنی بازاری قیمت کا تعین کرنے میں مہارت رکھتے تھے، اور نہ ہی کوئی ایسے ''شاہ'' یا ''جوہری'' تھے جو جوہر کی قدر پہچانتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گوہر نایاب جب تک حیات رہے تب تک وہ محفلوں کی رونق رہے، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے تذکرے واقفین کے دل ودماغ تک ہی محدود رہ گئے۔

جمیل مہدی مرحوم :جمیل مہدی مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے گوناگوں صفات سے نوازا تھا، ان کی ظاہری تعلیم تو کسی شمار و قطار میں نہیں تھی، لیکن ان کی تحریر و تقریر بڑے بڑے ڈگری ہولڈرز، خودی کے خول میں ملبوس بہت سے سند یافتہ دانشورانِ عظام، جبّہ و قبّہ کی فکر رکھنے والے بہت سے تہی مغز علمائے کرام، دوسروں کی اصلاح کی فکر میں غلطاں اور اپنی اصلاح سے بے خبر بہت سے خانقاہ نشین صوفیائے عظام، قلم و دوات سنبھالے الفاظ کا وزن تولنے والے بہت سے شعرائے کرام تشہیر کے خبط میں مبتلا بہت سے ادبائے کرام کاغذ کو سیاہ کرنے والے ان گنت صحافیوں اور اردو کی روزی روٹی پر گذر بسر کرنے والے خودساختہ خادمانِ اردو کو اپنے ماضی و حال کی اتنی خبر یا اپنے مستقبل پر اتنی نظر نہیں ہوگی جتنی دیوبند کی مٹی سے جنم لینے والے جمیل مہدی مرحوم کو تھی جنھوں نے جمیل مہدی مرحوم کو دیکھا ہے یا جنھوں نے ان کی تصویروں کا مشاہدہ کیا ہے انھوں نے ان کی ان بڑی بڑی مقناطیسی کشش والی آنکھوں کو ضرور دیکھا ہوگا جو ہر وقت کھلی ہی رہتی تھیں، یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی ملت، اپنی قوم بلکہ پورے عالمی حالات کا چشمِ وا سے مشاہدہ کیا ہے، جمیل مہدی مرحوم نے جس دور میں صحافت کو بطورِ مشن اختیار کیا اُن دنوں ٹیلی فون کی سہولیات بھی خال خال ہی کسی کو میسّر تھیں، لیتھو پرنٹنگ کا زمانہ، پیلے کاغذ کے مسطر پر اخبار کی کتابت، سنگسازی و طباعت کے مراحل کتنے دشوار گذار تھے؟ اس کا تصور بھی دشوار گذار ہے۔ اخبارات کا پیٹ بھرنے کے لیے جہازی سائز کے کم از کم آٹھ صفحات کی سیر شکمی، پھر روزانہ ان کی کتابت و طباعت اور قارئین تک پہونچانا کتنے مشکل ترین مراحل تھے ان کا تصور آج کے دور کے وہ صحافی حضرات کہاں کر سکتے ہیں جن کے کمپیوٹر پر پڑنے والی انگلی کی ایک کلک ''کرلو دنیا مٹھی میں'' کے دعوے کی تصدیق کرتی ہے، اتنی مشکلات کے دور میں اردو صحافت نے جن قد آور شخصیات کو جنم دیا ان کا کمال یہ تھا کہ ان کا لفظ لفظ دردِ دل کا عکّاس ہوتا تھا، اس لیے وہ قارئین کی نجی محفلوں سے لے کر سیاست کے بلند و بالا ایوانوں میں ملک کے اقتدار پر قابض حکمرانوں تک موضوعِ بحث بنتا اور ان پر توجہ دی جاتی۔ حالات سے نبرد آزما، ملّت کے غم میں مبتلا، ''سچ'' کو سچ کہنے والے صحافیوں کی فہرست سازی کی جائے تو جمیل مہدی مرحوم کا نام ان میں یقینی طور پر جانا پہچانا معروف نام ہوگا۔

جمیل مہدی مرحوم نے جن اکابر علمائے کرام و رہنمایان عظام کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا اور ان سے تربیت حاصل کی اس کا لازمی عنصر ان کی طبیعت میں رچ بس گیا تھا۔ شیخ الہند گو ان کے دنیا میں آنے سے بہت پہلے ہی فانی دنیا سے مونہہ موڑ چکے تھے، لیکن ان کے تربیت یافتہ بہت سے افراد ایسے تھے جن سے جمیل مہدی مرحوم نے شاگرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے اکتساب فیض کیا، ان کے معاملات کو جانچا اور پرکھا، ان کے انداز اور طور طریقوں کا مشاہدہ کیا، اس سے متأثر ہو کر ہی سادگی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔

جمیل مہدی مرحوم کی زندگی میں جن شخصیات نے اثر ڈالا وہ اپنے دور کی عبقری شخصیات تھیں۔ انھیں مضمون

نگاری کی مشق علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے جس انداز سے کرائی وہ جداگانہ تھا اس کے اثرات یہ مرتب ہوئے کہ وہ بڑے بڑے نامور نثر نگاروں کے اسلوب میں لکھنے پر قادر ہوگئے۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ انھیں بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے اور جمیل صاحب مرحوم کی تربیت میں اُن کا خاص دخل تھا۔ جمیل صاحب مرحوم علامہ شبیر صاحب مرحوم سے بہت زیادہ قربت محسوس کرنے کے باوجود وہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی مہاجرت پر اتفاق نہیں رکھ سکے۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ انھیں پاکستان کے سرکاری جریدے ''ماہِ نو'' کی ادارت سونپنا چاہتے تھے جس کے لیے علامہ نے اس وقت کے پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خاں تک سے بات کر لی تھی۔ بہت سے احباب کے پاکستان منتقل ہونے کے باوجود جمیل صاحب مرحوم کی طبیعت میں کبھی بھی پاکستان جانے کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوا۔ جمیل صاحب مرحوم نے ۱۹۴۷ء کے خونریز فسادات کے خوفناک نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ بھائیوں کو بھائیوں سے جدا ہوتے دیکھا تھا۔ ان فسادات کے مشاہدات سے براہِ راست واقفیت کی وجہ سے ان کے ذہن ونظریات کی وہ تشکیل عمل میں آئی جو ملکی، قومی، ملّی اور بین الاقوامی مسائل کو سمجھنے اور ان کے تحلیل وتجزیہ میں تاعمر کام آئی، بہرحال علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے انتہائی عقیدت ومحبت کے باوجود جمیل صاحب مرحوم کے دل ودماغ میں کسی بھی لمحہ ملک سے ہجرت کا خیال نہیں آیا۔

تحریک ریشمی رومال کے گلِ سرسبد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی شخصیت سے انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز میں انتہائی حوصلہ، پامردی، جرأت وہمت کے ساتھ زندگی کو بامقصد بنانے کا سبق حاصل کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شریعت کے اسرار ورموز کی تفہیم وتشریح کرنے والی کتاب حجۃ اللہ البالغہ اُس وقت میں پڑھی جب کہ ان کی مسیں بھی نہ بھیگ پائی ہوں گی۔ نہ وہ شریعت کو سمجھتے تھے نہ ہی اس کی مصلحتوں کو لیکن کم عمری میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی روحانی توجہات وتصرفات نے زندگی بھر ان کا ساتھ دیا۔ مرحوم نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو سفر وحضر میں دیکھا، ملت کے تئیں ان کے ان احساسات کو بھی ملاحظہ کیا وہ اُس واقعہ کے بھی چشم دید گواہ رہے جب مولانا سندھیؒ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے اس بات پر برہمی کا اظہار کیا کہ ''انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی قیادت کا فریضہ انجام دینے کے بجائے مسلمانوں کو کانگریس کی متابعت کی غلطی کا ارتکاب کیا۔ اس معاملہ پر طیش میں آکر وہ مولانا مدنیؒ کے پیچھے غصہ میں ڈنڈا لے کر دوڑے جسے مولانا مدنیؒ نے ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوئے گھر کی راہ لی۔ اور سفر میں ان حالات کے بھی گواہ بنے جب مولانا سندھیؒ کو لاہور جانا ضروری تھا اور ان کی جیب میں ایک آنہ بھی نہیں تھا، اتفاق سے جمیل صاحب مرحوم اور ازہر شاہ قیصر مرحوم لاہور جارہے تھے جن سے مولانا سندھی کی دیوبند اسٹیشن پر ملاقات ہوئی اور انھوں نے جمیل صاحب سے اپنا ٹکٹ بھی منگوایا اور لاہور تک سفر کیا، اثناءِ سفر میں مولانا نے جیب میں پیسے نہ ہونے اور ہر حالت میں لاہور پہونچنے کی

وجوہات بتائیں۔ راستے میں مولانا کا جگہ جگہ استقبال ہوا، لاہور پہنچنے پر مولانا کا شاندار خیر مقدم کیا گیا، راستے میں کسی صاحب کے ذریعہ مولانا کو ایک لفافہ دیا گیا جو انھوں نے جمیل صاحب کو سونپ دیا جس میں سو سو کے پانچ نوٹ (موجودہ زمانے کے کم از کم پچاس ہزار روپے) تھے۔ بعد میں جمیل صاحب کے اس خطیر رقم کے مطلع کرنے پر مولانا کا روپیوں کے تئیں اظہارِ بے نیازی ایسا واقعہ تھا جس نے جمیل صاحب کے مستقبل پر بہت زیادہ اثرات مرتب کیے اور وہ ہمیشہ پیسے سے بے رغبت رہے۔ یہ چیز ان کی شخصیت سازی میں بہت زیادہ معاون ہوئی۔ انھوں نے بعد کی زندگی میں پیسے کی پرواہ کیے بغیر ہر وہ کام کر ڈالا جس کی ان سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ جمیل مہدی مرحوم کے پڑوسی تھے۔ انھوں نے مولانا مرحوم کی بے نفسی کو بھی ملاحظہ کیا تھا اور ان کی سادگی و علمی تفوق کو بھی، مولانا مدنی مرحوم کے تئیں عقیدت مندوں کے غول کے غول بھی دیکھے تھے اور ان کے دروازے پر قطار در قطار کھڑے ان سیاسی غیر مسلم سورماؤں کو بھی جو بہت سے مسائل میں رہنمائی کے لیے مولانا مدنی کے مشوروں کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے تھے، مولانا مدنی مرحوم کی شخصیت بھی جمیل مہدی مرحوم کے زندگی کے سفر میں مدد و معاون رہی۔

تقسیم ملک کا سانحہ ایسا دل دوز سانحہ تھا جس نے تاعمر انھیں متاثر کیے رکھا۔ وہ پاکستان کے نظریہ سے کسی بھی درجہ میں موافقت نہیں رکھتے تھے لیکن وطن عزیز میں مسلمانوں کے سامنے جو مشکلات پیش آ رہی تھیں ان کی وجہ سے جمیل صاحب مرحوم کا ضمیر بے چین تھا وہ اس کے لیے فکر مند تھے کہ ان حالات میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ فسطائی طاقتوں کی بڑھتی یورشوں کو روکنے کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں؟ یقینی طور پر بدلتے حالات میں وہ نہ تو کسی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کچھ کرنے سے روک سکتے تھے اور نہ ہی شمشیر و تفنگ کے ذریعہ فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ اللہ نے انہیں جو قلمی و فکری صلاحیتیں دی تھیں انھیں پروان چڑھا کر وہ وطن سے محبت کرنے والے مسلمانوں و برادرانِ وطن کو جمہوری انداز سے آگے لاکر ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، اسی مقصد سے مرحوم نے باقاعدہ سوچ سمجھ کر صحافت کے میدان کا انتخاب کیا۔ ہم فکر و ہم نوا افراد کے ساتھ مل کر دیوبند میں ماہنامہ ہادی سے اس کام کو انجام دینا شروع کیا تو تحریر میں جولانیوں کی بدولت اصحاب بصیرت افراد نے اس جوان کے اندر ایک ایسی رمق محسوس کی جو ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے تئیں پریشان ضرور ہے لیکن یہ جرأت مند صحافتی قلم ملت کے مستقبل کے لیے کچھ خطوط متعین کر کے ان کی پائیدار اور ایسی مضبوط شاہراہوں کی فراہمی میں معاون ہوسکتا ہے۔ صحافت سے وابستہ جمیل مہدی کی تحریروں سے بزرگانِ ملت کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ یہ جوان، ملک میں آباد مسلمانوں کے قدم جمانے اور انھیں خوف زدگی کی کیفیت سے نجات دینے کے لیے فکری راہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی کوششیں بھی کرسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مضبوطی کے ساتھ رہنے اور مسلمانوں کو جمے رہنے کا حوصلہ مرحوم کو جہاں مولانا آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی عتیق الرحمان جیسے اکابرین کی استقامت وعزیمت سے ملا وہیں انہیں اپنے والد کی اس رائے سے بھی پختگی حاصل ہوئی کہ ''اس وقت ہندوستان میں ایک برس کی دہشت ناک زندگی پاکستان کی سو برس کی بے خطر زندگی کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ قدر اور حقیقی جہاد کے برابر اہمیت کی حامل ہے'' ظاہر ہے جب ان کی خانگی وسماجی زندگی میں ہم آہنگی تھی تو انہیں ان خطوط پر کام کرنے کا موقع اور آسان ہوگیا۔

جمیل مہدی صاحب مرحوم فطری طور پر ایک ادیب تھے، اپنے ادبی ذوق کی نشو ونما کی خاطر وہ معروف ادبی رسالے ''شاعر'' سے آزادی کے بعد اس وقت وابستہ ہوئے جب اسے آگرہ سے بمبئی منتقل کیا جارہا تھا۔ ملک کے بدلتے منظرنامے نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ خیالات وتصورات کی افسانوی دنیا سے باہر نکل کر اُن زمینی حقائق کو تلاش کریں جو ملت کی ناؤ کو پار لگانے میں معاون ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر وہ ۱۹۵۰ء میں مولانا حامد الانصاری غازی مرحوم کی معیت میں روزنامہ جمہوریت کی ادارت سے وابستہ ہوگئے۔ اس دوران انھوں نے بہت سے ملکی رہنماؤں کا قریب سے مشاہدہ کیا، ان کی فکر کو جانچا پرکھا، ملک وملت کا جائزہ لیا اور ملت کو سیاسی بھنور سے نکالنے کے لیے فکری وعملی کوششیں بھی کرتے رہے۔ روزنامہ 'جمہوریت' جس نے بعد 'ہفت روزہ' کی شکل اختیار کرلی تھی کے ذریعہ جمیل صاحب مرحوم نے کم وبیش آٹھ سال تک متواتر اپنی صحافتی تحریروں سے ملت کی نہ صرف نبض شناسی کا فریضہ انجام دیا بلکہ ملت مرحومہ کو احساس کمتری سے نکالنے کے لیے تیر بہ ہدف نسخے بھی تجویز کیے۔ ۱۹۵۷ء میں جمہوریت کے بند ہونے کے بعد جمیل صاحب مرحوم اپنے وطن دیوبند واپس ہوکر آزادانہ صحافت کرنے لگے۔

جمیل مہدی مرحوم حق گو، بے باک، جرأت مند صحافی تھے۔ ان کے یہ اوصاف صرف کاغذوں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی جھلکتے تھے۔ وہ علماء کے اس ٹولے سے ہمیشہ بیزار رہے جو ظاہری جبّوں، قبّوں کے اہتمام کی آڑ میں سادہ لوح مسلمانوں کو ''شکار'' بنانے کے عادی رہے۔ اس کے بہت سے بیوپاریوں کا انھوں نے مشاہدہ بھی کیا اور ان سے مچیٹھا بھی لیا، ملّی تنظیموں سے وابستگی ان کا مشن تھا۔ اتحادِ ملت کی کوئی بھی کوشش ہوتی تو وہ اس کا دل وجان سے خیر مقدم کرتے۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں جمیل صاحب مرحوم، ان کے رفیقِ خاص عامر عثمانی اور دوسرے بہت سے ایسے حضرات کی دعوت پر ہی دیوبند میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت (جو اگست ۱۹۶۴ء میں ہی ملّی تنظیموں کے وفاق کی شکل میں وجود میں آئی تھی) کا اجلاس دیوبند میں ہوا۔ اس اجلاس کو سبوتاژ کرنے میں ایک ایسی جماعت نے انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا جس کے تقدس کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ اس جماعت کے بہت سے ذمّہ داران کے دیوبند سے وابستہ ہونے کے باعث سادہ لوح معصوم طلبائے عزیز کے ذریعہ اجلاس کو درہم

برہم کرانے میں کامیاب ہوگئے نوبت یہاں تک پہونچی کہ اسٹیج پر سربرآوردہ سربراہانِ ملت ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مفتی عتیق الرحمان عثمانی، مولانا منظور نعمانی اور مشہور سیکولر لیڈر پنڈت سندر لال جیسے حضرات کو باقاعدہ مارا پیٹا گیا، اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ فرنیچر اور شامیانے تک کو آگ لگادی گئی۔ جس وقت یہ مرحلہ پیش آیا اس وقت جمیل صاحب مرحوم خطبۂ استقبالیہ پڑھ رہے تھے، مرحوم نے مخالفین کی چیرہ دستیوں کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے پیغام کو برملا سنایا، لیکن اس واقعہ نے ان کے سامنے بہت سے ''تسبیح خوانوں'' کی اندرونی حقیقت کو اجاگر کردیا، یہ واقعہ مرحوم کی زندگی کا یوٹرن ثابت ہوا اور انھوں نے خودساختہ ''ملّی رہنماؤں'' کے چہروں پر پڑے نقاب کو اتارنے کا عزمِ مصمّم کرلیا اور اپنے قلم کو اس کے لیے وقف کردیا، اس میں کامیابی یا ناکامی کا تجزیہ تو مرحوم نے کبھی نہیں کیا لیکن اشہبِ قلم کو ''زرد قیادت'' کے خلاف وقف کردیا۔ لکھنؤ کو مستقر بنا کر ڈاکٹر فریدی مرحوم کے روزنامہ ''قائد'' اور پھر ہفت روزہ ندائے ملّت سے وابستہ رہے۔ تقریباً ایک سال سے کچھ زائد عرصہ تک اس کو صحیح سمت دینے کی کوشش کی جب اس میں کامیابی نہیں ملی تو پھر مایوس ہوکر دیوبند آگئے، کچھ دنوں بعد لکھنؤ سے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کی ادارت میں ہفت روزہ 'ندائے ملت' بہت طمطراق کے ساتھ شائع ہوا۔ مدیر محترم کے پیہم اصرار بلکہ ان کی ذاتی کوششوں کے نتیجہ میں اس کی مجلس ادارت سے منسلک ہوگئے۔ ندائے ملّت کے ٹرسٹیوں کے آپسی اختلافات کی وجہ سے اس سے بددل ہونے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا عزم کیا اور اس عزم کو ہفت روزہ ''عزائم'' کی شکل میں ظاہر کیا ''ہفت روزہ عزائم'' کی خوبصورت طباعت و کتابت، اس کے صفحات، مضامین، پابندیِ وقت کے ساتھ مسلسل اشاعت ان حضرات کے ذہنوں میں تاہنوز باقی ہونگیں جنھوں نے گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں اردو اخبارات کا پابندی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ تقریباً دس برس تک ہفت روزہ نکالنے کے بعد پھر عزائم روزنامہ ہوگیا، اردو قارئین کی روز مرّہ کمی، معیاری اردو روزناموں کے لیے مذہبی، تہذیبی، سماجی اقدار کی پاسداری کے سبب اشتہارات کا فقدان ہر روز اخراجات میں مسلسل اضافے نے جمیل مہدی مرحوم کی زندگی میں ہی ان خدشات کو تقویت دینی شروع کردی تھی کہ اب یہ اخبار ''آخری لو بھی چراغوں کی بجھی جاتی ہے'' کے مانندان ملّی اخبارات کی صف میں جا کھڑا ہوگا جن کا مرثیہ مستقبل کا مؤرخ ضرور لکھے گا لیکن جمیل صاحب مرحوم نے کم ازکم اپنی زندگی میں اس کی رگوں میں اپنا خون دوڑا کر مُردہ اخباروں کی صف میں پہونچنے نہیں دیا تاہم اس غم میں اپنی جان ضرور جانِ آفریں کے سپُرد کردی، فروری ۱۹۸۸ء میں مرحوم کے انتقال کے بعد روزنامہ عزائم بھی ملّتِ مرحومہ کے اُس ''خبرستان'' میں دفن ہوگیا جس میں اردو صحافت کے جنم داتا مولوی باقر مہدی سے لے کر جمیل مہدی مرحوم تک کے نہ جانے کتنے اخبارات ''خبروں'' کی ''قبر'' میں دفن ہیں اور کوئی ان پر فاتحہ پڑھنے والا بھی نہیں۔

جمیل مہدی مرحوم جب تک زندہ رہے وہ زندہ دلی کے ساتھ زندگی گذارنے کے عادی رہے۔ مرحوم کو جب

کبھی بھی دیوبند میں دیکھا انہیں زعفران زار محفلوں کا ہیرو رہتے ہوئے سرسٹہ بازار میں لطیف کے ہوٹل پر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خواجہ بلال کی دوکان (موجودہ مکتبہ نعیمیہ) پر دوسرے احباب کے ساتھ سیر حاصل تبصرے کرتے ہوئے جامع مسجد سے محل تک بنی ہوئی دوکانوں کے لینٹروں پر بیٹھ کر کبوتر بازوں کے ساتھ کبوتروں کی صفات بیان کرتے ہوئے، راستے میں چلتے پھرتے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضاؤں میں بکھیرتے ہوئے دیکھا، انھوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ چلتا پھرتا، عام سا انسان اپنی بہت سی خوبیوں کے باعث ''اخص الخواص'' ہے۔ اپنی مجرّدانہ زندگی کے باعث وہ اپنے شیدائیوں کو کوئی ایسی نشانی بھی نہیں دے کر گئے جس کو دیکھ کر اس نسل میں کسی اور جمیل مہدی کی پیداوار کے تخمینے لگائے جاتے اور نہ ہی اپنی لاابالی طبیعت کے باعث اپنا کوئی ایسا جانشین چھوڑ کر گئے جسے جمیل مہدی ثانی کہا جاتا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے۔ فروری ۱۹۸۸ء کے آخری ہفتہ (غالباً ۲۷/فروری ۱۹۸۸ء) کو مرحوم کی نمازِ جنازہ جامع مسجد دیوبند میں اور تدفین اس قبرستان قاسمی میں عمل میں آئی۔ جمیل مہدی مرحوم کے متعلق بلاشبہ شاعر کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

✦.....❖.....✦

ایران وسعودی کشمکش

❖ ایم ودود ساجد/دہلی

مجھ سے میرے دوست جلد ناراض نہیں ہوتے۔ فی الواقع بات بھی یہی ہے کہ میں اشوز پر متوازن اور معتدل رائے رکھتا ہوں اور اسی کا اظہار بھی کرتا ہوں لیکن یہ بھی درست ہے کہ میں اظہارِ رائے کے وقت کسی بھی فریق سے اپنے تعلق کو پیش نظر نہیں رکھتا۔ لہٰذا میرے چند شیعہ دوست (پہلی بار) مجھ سے بہت ناراض ہوگئے ہیں۔ انہوں نے مختلف سماجی ذرائع ابلاغ پر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی آسانی سے لکھ دیا ہے کہ ''پٹیر و ڈال میں بڑی جان ہوتی ہے۔'' مجھے افسوس ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں نے حق بات لکھنے اور کہنے میں کبھی صدر جمہوریہ کی پرواہ کی اور نہ وزیراعظم کی، میرے دوستوں نے مجھے پٹیر وڈالر کا فقیر بتادیا۔ میں نے لکھا اور کہا کیا تھا وہ بتانے سے پہلے اپنے ان ایران نواز دوستوں سے یہ پوچھنا ہے کہ مرحوم شاہی امام سید عبداللہ بخاری اپنی پوری زندگی ایران کی حمایت کرتے رہے، کیا انہیں ایران یورو پہنچایا کرتا تھا؟ اس کے علاوہ بہت سے معاملات میں ہندوستان کے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں نے جن میں سنیوں کی تعداد زیادہ ہے دہائیوں سے ایران کی حمایت وتائید کی ہے اور امریکہ کے مقابلے میں ایران کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ کیا ایران اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں میں ایرانی درہم ودینار بانٹتا رہا ہے؟ پیٹروڈالر کی بات کہہ دینا کتنا آسان ہوتا ہے، لیکن حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے ہمارے یہ بھائی تیار نہیں ہیں۔

سعودی عرب میں گردنیں اڑائے جانے کا واقعہ کوئی نیا نہیں ہے۔ وہاں اکثر ایسی سزائیں وہاں کے قانون کے مطابق دی جاتی رہی ہیں۔ اکثر عرب ملکوں میں جہاں شاہی نظام قائم ہے حکمرانوں کے سیاسی مخالفین اور ملک کے باغیوں کو خاموشی کے ساتھ سزائیں دی جاتی ہیں لیکن سعودی عرب اس سلسلے میں ایک استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں دی جانے والی سزاؤں کو پردۂ خفا میں نہیں رکھا جاتا۔ ان کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی ہے اور سزا عوامی مجمع میں دی جاتی ہے تاکہ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہو۔ پھر وہاں باقاعدہ شرعی عدالتی نظام قائم ہے اور ملزمین کو اپنی بات رکھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں سعودی نظام کا دفاع کرنے کا مکلّف نہیں ہوں۔ نہ میں نے اس کی کوئی ذمہ داری قبول کی ہے۔ نہ میرا اُن سے یا ان کے نمائندوں یا ان کے خیرخواہوں سے کوئی ربط ہے۔

میں اکثر وہاں کے معاملات پر کوئی رائے ظاہر بھی نہیں کرتا لیکن سعودی عرب میں گردنیں اڑائے جانے والے تازہ واقعہ نے ہندوستان میں ایک عجیب وغریب بحث چھیڑ دی ہے۔ بحث میں جو پہلو ہمارے بھائیوں کی طرف سے اجاگر کیا جارہا ہے اس سے مجھے تشویش ہوئی، اس لئے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف طبقات میں اس سلسلے میں باہمی رنجش وچشمک بڑھ گئی تو وہ موجودہ دور میں انتہائی خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہوگی۔ میں نے باوجود اس کے کہ بہت سے حلقوں نے اس طرف توجہ دلائی۔ اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا لیکن جب میڈیا کے مختلف ذرائع اس ایشو پر ایک خطرناک بحث میں بہت آگے بڑھ گئے تو میں نے اس رائے کا اظہار کیا۔

''یہ بہت پیچیدہ ایشو ہے، اس واقعہ پر سرسری معلومات رکھنے والے افراد کوئی واضح تبصرہ نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے سعودی حکومت اور حکمرانوں کی طرز فکر سعودی معاشرے اور سعودی عرب کی تاریخ کا بھرپور نہ سہی کچھ تو علم ضرور ہونا چاہئے۔ چوں کہ ایران، شیخ النمر اور دوسرے شیعہ سعودی شہریوں کو سزائے موت دیے جانے کے سبب آتش زیر پا ہے، اس لئے سعودی ایران رشتوں کا علم بھی ضروری ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہم ہندوستانی اس واقعہ پر کوئی زیادہ ردعمل ظاہر نہ کریں تاہم احباب کے تجسس کے پیش نظر مندرجہ ذیل رائے کا اظہار مناسب ہوگا:

۱- ایران وہ واحد ملک ہے جو حرمین شریفین کے انتظام میں بین الاقوامی نظام کے بہانے اپنا تصرف چاہتا ہے۔ اس خواہش کا ایک بڑا سبب اہل بیت کی معلوم قبروں پر بغیر کسی قدغن کے براہِ راست عبادت گزاری کا غیر شرعی جذبہ ہے۔ سعودی حکومت اور سعودی معاشرہ توحید کے معاملے میں انتہائی محتاط اور پابند ہے۔ اس لئے وہ ایرانی مہم کے عواقب سے بخوبی واقف ہے۔

۲- سعودی عرب کے مشرق میں القطیف صوبے میں شیعہ آبادی کثرت سے ہے، گو کہ وہ اپنے مراسم کی ادائیگی میں آزاد ہیں تاہم شرکیہ، منافرت انگیز اور مکروہ مراسم سعودی مزاج سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔ ایران یہ سمجھتا ہے کہ وہ عرب ممالک میں آباد شیعوں کو عربوں کے خلاف اٹھا کر کوئی بڑا انقلاب برپا کرسکتا ہے، اس لئے وہ عرب شیعوں کی خفیہ مادی اور عسکری مدد میں بھی مصروف ہے۔ عراق، یمن، شام، لبنان اور بحرین جیسے عرب ملکوں میں اس کی خارجہ پالیسی مختلف ہے جب کہ دوسرے عرب ملکوں میں اس سے مختلف۔ یمن کے باغیوں کو وہ سعودی عرب کے لئے خطرہ بنانا چاہتا تھا لیکن سعودی عرب نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ان کی کمر توڑ دی ہے۔ اس پر ایران مضطرب ہے۔

۳- سعودی عرب دوسرے کسی بھی مسلم اور عرب ملک سے سراسر مختلف ہے، اس لئے کہ وہاں حرمین شریفین موجود ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان وہاں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال مذہبی فریضہ انجام دینے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہاں کے انتظام کی ایک منفرد حساسیت ہے۔ اس اعتبار سے وہاں کے حکمرانوں کو بھی حساس ہونا ضروری ہے۔ ہر ملک کی

داخلی سلامتی کا اپنا نظام ہوتا ہے۔ گردنیں اڑانے کا جو واقعہ رونما ہوا ہے وہ باقاعدہ ایک طویل عدالتی کارروائی کے بعد ہوا ہے۔''

اس کے بعد یہ خبر آئی کہ شام کے ایک اسکول پر روسی جہازوں نے حملہ کر کے آٹھ معصوم بچوں اور ان کے بارہ استاذوں کو شہید کر دیا۔ میں نے سوال اٹھایا کہ قاتل بشار الاسد کے دوست ایران کو اس واقعہ پر سانپ کیوں سونگھ گیا؟ اس کی لیڈر شپ کی طرف سے ایک سطری بیان بھی جاری نہیں ہوا۔ وہ اب بھی قاتل اور بلیک میلر روسی صدر پوتن کو انسانیت نواز سمجھے ہوئے ہے۔ روس، شام میں داعش کے خلاف جنگ کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ بے گناہ شہریوں کو ہلاک کر رہا ہے۔ میں نے مختلف مواقع پر یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ جب ایران، عراق کی آٹھ سالہ جنگ میں روس عراق کا ساتھ دے رہا تھا تو وہ ایران کی نظر میں انتہائی معتوب اور دشمن اسلام ملک تھا، لیکن آج جب وہ قاتل بشار الاسد کا ساتھ دے رہا ہے تو ایران کی نظر میں وہ مسلم دوست اور انصاف پسند کیسے ہو گیا؟

ایک تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ سعودی عرب میں شیعہ عالم شیخ النمر کو سزائے موت دیے جانے کے بعد جس طرح ہمارے بھائیوں نے یہاں ہندوستان میں نفرت انگیز مہم چھیڑی ہے اس کے نتائج کا تصور کر کے روح لرز اٹھتی ہے۔ اس لئے میں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ جو لوگ اس واقعہ پر احتجاج کر رہے ہیں وہ ان کا حق ہے اور اس حق کا احترام کیا جانا چاہئے لیکن جو لوگ اس کی توجیہ بیان کر کے سعودی عرب کی حمایت کر رہے ہیں وہ بھی ان کا حق ہے اور اس حق کا بھی احترام کیا جانا چاہئے۔ شیخ النمر کو سزا نہ ہندوستان میں دی گئی ہے اور نہ ہندوستانی مسلمانوں نے دی ہے۔ ہمارے شیعہ دوست اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ہندوستان کے سنی علماء اور عوام کو بھی مطعون کر رہے ہیں۔ یہ قطعی نامناسب طرزِ عمل ہے۔ اس وقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو اتحاد کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ سعودی عرب کے واقعہ کو بنیاد بنا کر اگر ہم منتشر ہو گئے تو اس کا نقصان دونوں کو ہوگا۔ کیا ہمارے یہ ایران نواز دوست اس پہلو پر غور کریں گے؟

✦.....❖.....✦

فقہ وفتاویٰ

❖ مولانا مفتی نثار خالد دیناجپوری
استاذ حدیث جامعہ ہذا

سوال : بعد نماز فجر یا بعد نماز عصر جنازہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟

جواب : نماز جنازہ کا ان دونوں وقتوں میں ادا کرنا درست ہے۔فقہاء نے لکھا ہے کہ ان وقتوں میں یعنی فجر کی فرض نماز اور عصر کی فرض نماز کے بعد کسی بھی فرض کو ادا کرنا درست ہے اور نمازِ جنازہ فرض کفایہ ہے۔حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی ص ۱۸۸ میں ہے **اما الواجب لعینه وهو ماكان بايجاب الله ولا مدخل فيه للعبد سواء كان مقصوداً لنفسه كمخالفة الكفار و موافقة الابرار فی سجود التلاوة او كان مقصوداً لغيره كقضاء حق الميت فی صلاة الجنازة فلا كراهة فيه و مثل ما ذكر بعد صلاته ای الفجر و بعد صلاة العصر الخ.**

سوال : زید کا معمول رات کے اخیر حصہ میں نمازِ تہجد کے ساتھ نمازِ وتر پڑھنے کا ہے مگر اتفاق ہے کہ ایک دن اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلی اور صبح صادق ہوگئی تو کیا وہ صبح صادق کے بعد وتر کی نماز پڑھ سکتا ہے؟

جواب : مذکورہ صورت میں زید صبح صادق کے بعد وتر کی قضا کرسکتا ہے،اس لئے کہ وتر کی نماز واجب ہے اور نمازِ واجب کی قضا جس طرح دیگر اوقات میں کی جاسکتی ہے اسی طرح بعد از صبح صادق بھی کی جاسکتی ہے۔کبیری ص ۲۰۸ میں ہے **(و اما الوقتان) الآخران من الخمسة (فانه يكره فيهما) التطوع فقط ولا يكره فيهما الفرض) ای اللازم عملاً فيشمل الواجب. الخ.**

سوال : ایک تہجد گزار شخص ہے،اس کا تہجد ایک رات فوت ہوگیا،اب وہ چاہتا ہے کہ معمول کا ناغہ نہ ہوجائے ورنہ سستی بڑھ جائے گی،لہٰذا اس نے نمازِ فجر کے وقت سنتِ فجر سے قبل بہ نیت نفل چار رکعت پڑھ لی، سوال یہ ہے کہ اس کا یہ کرنا کیسا رہا؟

جواب :مسئولہ صورت میں تہجد گزار شخص کا اس طرح بہ نیت نفل چار رکعت سنت فجر سے قبل پڑھنا درست نہیں ہوا کیوں کہ شریعت میں صبح صادق کے بعد کسی بھی قسم کی نفل نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی قرار دیا گیا ہے۔البتہ

شخص مذکور کا یہ جذبہ کہ آئندہ مزید سستی بڑھ نہ جائے لہٰذا علاجِ نفس کے طور پر بہ نیت نفل چار رکعت پڑھ لینا قابل قدر ہے مگر اس کے لئے کوئی ایسا وقت تجویز کرنا چاہئے جس میں نفل نمازیں پڑھنا مکروہ نہ ہو یعنی وہ بلا کراہت پڑھی جاسکتی ہوں۔

سوال : اپنا معمول فجر کی سنت اور فرض کے درمیانہ وقفہ میں تلاوتِ قرآن کریم کا ہے، ایک دن کی بات ہے کہ دورانِ تلاوت آیتِ سجدہ آ گئی، میں نے اس کی تلاوت کی اور سجدہ نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا میں اُسی وقت سجدہ کرسکتا ہوں؟

جواب : کتب شریعت میں لکھا ہے کہ آیت سجدہ کی تلاوت کے بعد سجدہ کرنا واجب ہے اور کسی بھی واجب شرعی کو سنت فجر کے بعد فرض سے قبل ادا کرنا بلا کراہت جائز و درست ہے جیسا کہ مراقی مع الطحطاوی ص۴۷۹ میں ہے (وهو) ای سجود التلاوة (واجبٌ) الخ اور طحطاوی علی المراقی ص۱۸۸ میں ہے و اما الواجب لعينه وهو ما كان بايجاب الله تعالیٰ و لا مدخل للعبد فيه. الخ.

سوال : ایک شخص اپنے گھر میں عصر کی نماز تنہا پڑھ چکا ہے، پھر وہ باہر نکلا تو دیکھ رہا ہے کہ مسجد میں جماعت ہورہی ہے، پس وہ اس میں شامل ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ اس کا یہ شامل ہونا کیسا ہے؟

جواب : صورتِ مسئولہ میں اس کا جماعت میں شامل ہونا درست نہیں ہے کیوں کہ وہ عصر کی فرض نماز اپنے گھر میں پڑھ چکا ہے۔ اب وہ امام کے ساتھ شامل ہو کر جو نماز پڑھے گا وہ اس کی نفل نماز ہوگی اور عصر کی فرض کے بعد نفل نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ عن انس رضی الله عنه انه سئل من التطوع بعد العصر فقال: كان عمرؓ يضرب الايدى على صلوة بعد العصر الحديث کبیری ص۲۱۰، بحوالہ مسلم شریف و فی المراقی مع الطحطاوی ص۴۵۰ (ثم) بعد الاتمام (اقتدى متنفلاً) ان شاء وهو افضل لعدم الكراهة (الا فی العصر) والفجر للنهى عن التنفل بعد هما الخ.

سوال : میں فجر کی نماز پڑھ رہا تھا، قعدۂ اخیرہ کیا، بے خیالی میں اس کے بعد کھڑا ہوگیا اور تیسری رکعت مکمل کرلی، پھر مجھے یاد آیا کہ مجھے تو دو ہی رکعت پر سلام پھیرنا ضروری تھا، ایسی صورت میں بتایئے میں کیا کروں؟ چوتھی رکعت ملالوں یا پھر تیسری رکعت ہی پر قعدہ کر کے سلام پھیروں؟

جواب : مذکورہ بالا صورت میں جب آپ نے دو رکعت پر قعدہ کرلیا ہے، اس لئے آپ کی نماز سجدۂ سہو کے ساتھ ہوجائے گی، البتہ اب یہ آپ کی مرضی پر ہے آپ چاہیں تو ایک اور رکعت بھی ملالیں اور چاہیں تو نہ ملائیں اور قعدہ کر کے نماز پوری کرلیں، بہرصورت آپ کو سجدہ سہو کرنا ہوگا کیوں کہ سلام میں تاخیر ہوگئی۔

واضح رہے کہ چوتھی رکعت یعنی مزید برآں ایک اور رکعت ملانے کی صورت میں اخیر کی دو رکعتیں نفل اور

شروع کی دو رکعتیں فرض شمار ہوں گی اور اس صورت میں فجر کی فرض نماز کے بعد نفل نماز پڑھنا جو لازم آیا یہ چوں کہ بغیر قصد وارادہ کے ہوا ہے، اس لئے یہ مکروہ نہیں ہوگا۔ حاشیۃ الطحطاوی ص ۴۷۰ میں ہے (و ضـــــم استحباباً) سواء كان في وقت كراهة او لا في الاصح وما قيل انه لا يصح في وقت كراهة كوقت العصر والصبح ضعيف ذكره الحموي و في السيد عن النهر ينبغي ان يكون محل الخلاف ما اذا لم يكن وقت كراهة فان كان لم يندب لم يجب وهل يكره الا صح لا، وعليه الفتوى و في النهر ص ۳۳۰، ج او على هذا فالاولىٰ ان يكون معنى ضم اى جاز له الضم ليعم كل وقت و كذا في الغنية ص ۴۰۰، و فيها ويسجد للسهو لانه اخر واجباً وهو السلام الخ.

ســـوال : آج کل بہت ساری مسجدوں میں اعلان ہوتا ہے کہ سورج نکل گیا ہے، لہٰذا ۲۰ رمنٹ بعد نماز پڑھیں، سوال یہ ہے کہ یہ اعلان کرنا کیسا ہے؟

جـواب : یہ اعلان کرنا بہتر ومناسب نہیں ہے کیوں کہ مسلمانوں میں اسلامی فرائض کو ادا کرنے کے تئیں غفلت و بے التفاتی ایک عام وبا بن چکی ہے۔ ایسے لوگوں کی آج کمی نہیں ہے، جو کسی طرح نیند سے بیدار ہو کر بہ مشکل تمام نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اب وہ کسی طرح بیدار ہو کر نماز پڑھنے کو تیار ہوئے اور اُدھر اعلان ہو جائے کہ سورج نکل چکا ہے۔ لہٰذا اس وقت نماز نہ پڑھیں، ۲۰ رمنٹ بعد نماز پڑھیں تو پھر ان کی غفلت سوا ہو جائے گی، پھر وہ نماز ہی چھوڑ بیٹھیں گے جب کہ وہ اگر اُسی حالت میں نماز پڑھ لیتے تو بعض فقہی روایات کی بنیاد پر ان کی نماز ہو جاتی۔ چنانچہ مراقی مع الطحطاوی میں لکھا ہے (ولا ننهى كسالى العوام عن صلاة الفجر) وقت الطلوع لانهم قد يتركونها بالمرة والصحة على قول مجتهد فيه اولىٰ من الترك الخ و روى عن ابى يوسف ايضاً جواز الفجر اذا لم يكن تاخيره الى الطلوع قصداً (حاشية الطحطاوى على المراقى)

✦……❖……✦

جامعہ کی سرگرمیاں

❖ مولانا فضیل احمد ناصری القاسمی
استاذ حدیث جامعہ ہٰذا

شش ماہی امتحان کا انعقاد : ماہ ربیع الثانی کا اختتام قریب آتے ہی طلبہ شش ماہی امتحان کی تیاریوں میں لگ گئے، مذاکرات اور مطالعات کا دور سرگرمی سے جاری ہے۔ دریں اثناء دفتر تعلیمات سے امتحان کا اعلان ہوگیا، جس کے اعلامیہ کے مطابق ۲۰/تا۲۴/فروری ۲۰۱۶ء یہ امتحان منعقد ہوگا۔ مجلس تعلیمی نے محترم جناب مولانا مفتی محمد نوید صاحب قاسمی استاذ حدیث جامعہ اور محترم مولانا ابوطلحہ اعظمی استاذ جامعہ ہذا کو بالترتیب ناظم اور نائب ناظم نامزد کیا ہے۔

خیال رہے کہ جامعہ کے تمام امتحانات میں دوسرے ادارے کے ماہر مدرسین کو بہ طور ممتحن مدعو کیا جاتا ہے تاکہ جامعہ کی تعلیمی حالت اور اصلاحات کا تجزیہ کیا جاسکے۔ الحمدللہ اس کے خاطر خواہ فوائد سامنے آرہے ہیں اور جامعہ ان کے تجزیات کی روشنی میں بہتری کی جانب مسلسل گامزن ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف دیوبند سمیت مختلف نام ور اداروں سے جید اہل علم کو امتحان کے لئے زحمت دی جاتی ہے۔

مسابقہ کا کامیاب انعقاد : طلبہ کی تیاریوں کو حتمی شکل دینے کے لئے درجہ عربی سوم تک کے طلبہ کا باہم مسابقہ حضرت مولانا مفتی وصی احمد صاحب قاسمی استاذ حدیث و ناظم تعلیمات جامعہ ہذا کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ مسابقہ کی حکمیت کے فرائض محترم جناب مولانا عبدالرشید صاحب بستوی دامت برکاتہم، محترم مولانا محمد صغیر صاحب پرتاپ گڑھی، محترم مولانا مفتی نثار خالد صاحب دیناجپوری اساتذۂ حدیث جامعہ ہذا نے انجام دیئے۔ طلبہ نے اس میں شرکت کے لئے خاصی تیاریاں کی تھیں، ہر جماعت سے تین پوزیشن رکھی گئی تھیں، اوّل پوزیشن لانے والے طلبہ کو فی کس مبلغ -/1200 روپیے، دوم پوزیشن لانے والے طلبہ کو مبلغ -/1000 روپیے اور سوم پوزیشن لانے والے طلبہ کو مبلغ -/800 روپیے نقد انعامات سے نوازا گیا۔

وضع قطع کی جانچ : دوسال پیش تر مقرر کردہ ضابطے کے مطابق امتحانات میں شرکت کے مجاز وہی طلبہ ہوں گے جن کی وضع قطع جانچ کمیٹی کی صادر کردہ ہوگی۔ اسی ضابطے کے پیش نظر طلبہ کی وضع قطع کی جانچ

مختلف اساتذہ نے کی۔حضرت مولانا شیث احمد صاحب مظاہری اور حضرت مولانا مفتی نثار خالد صاحب قاسمی اور محترم مولانا مفتی محمد ساجد صاحب اساتذۂ جامعہ ہذا نے نظر فرما کر دفتر تعلیمات کو اپنی تحریری رپورٹ دی۔

دعائیہ تقریب میں اساتذہ کی شرکت : درجہ حفظ کے ایک طالب علم محمد حسین مظفرنگری کی تکمیل حفظ قرآن کریم کی مناسبت سے ایک دعائیہ تقریب کا اہتمام ہوا، جن میں اساتذۂ جامعہ نے شرکت کی۔ حضرت مولانا شیث احمد صاحب مظاہری نے دعا کرائی۔ اختتام مجلس کے موقع پر اساتذہ نے استاذ شعبۂ تحفیظ القرآن محترم جناب قاری بلال احمد صاحب سہارن پوری کو مبارک باد دی۔ الحمدللہ ہر سال حفاظ کی ایک بڑی تعداد یہاں تیار ہوتی ہے۔

یوم جمہوریت کا جشن : ہر سال کی طرح امسال بھی گذشتہ ماہ یوم جمہوریہ کا جشن منایا گیا۔ اس موقع پر ایک مختصر اجلاس کا انعقاد ہوا، جس میں اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ اجلاس کا افتتاح مولوی عطاء اللہ کشمیری سلمہٗ شریک تکمیل افتاء کی تلاوت سے ہوا، بعدہٗ عزیزم مشتاق احمد سلمہٗ متعلم عربی چہارم نے نعت شریف پڑھی اور آخر میں ترانہ ہندی بھی پیش کیا جب کہ عزیزم رہبر صادق متعلم عربی چہام نے جنگ آزادی میں مدارس کا کردار اور دور حاضر میں درپیش چیلنجز کے موضوع پر تقریر کی۔ اجلاس کی صدارت حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم نے جب کہ نظامت مولانا محمد ساجد صاحب بستوی نے کی۔ حضرت مولانا شیث احمد صاحب مظاہری نے اپنے خطاب میں کہا کہ مغلیہ دور حکومت میں فرنگیوں نے انتہائی عیاری سے اس ملک میں اپنے پیر جمائے۔ ان کا مشن ہندوستان پر قبضہ سمیت یہاں کی تہذیب کا خاتمہ تھا، جس میں بہت حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ملک کے غیور علمائے اسلام اور برادرانِ وطن نے ملک کو انگریزوں کا سخت مقابلہ کیا، جس کے نتیجے میں یہ آزادی ملی۔ اس ملک کا دستور جمہوری رکھا، جس کے مطابق ہر شہری کو برابری کے حقوق حاصل ہوں گے۔ ۲۶/جنوری کو یہ دستور منظور ہوا، اسی لئے اس دن کو جشنِ جمہوریت منایا جاتا ہے۔ حضرت کی پراثر دعاء کے ساتھ مجلس کا اختتام ہوا۔ اس موقعہ سے جامعہ میں یک روزہ تعطیل بھی رہی۔

اسٹیل کا گرل : دارالحدیث انور ہال کی تعمیری سرگرمیاں الحمدللہ شباب پر ہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سے اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچ گئے۔ تفصیلات کے مطابق مغربی سیڑھیوں (زینے) پر پتھر کی تنصیب کے بعد گرل کا کام بھی مکمل ہوگیا۔ نیچے سے اوپر تک اسٹیل کا گرل لگایا گیا ہے۔ مشرقی زینے پر بھی پتھر نصب کردیئے گئے ہیں۔ گھسائی بھی تکمیل پذیر ہوچکی ہے۔ گرل لگنے کا کام یہاں بھی جلد ہی شروع ہوجائے گا۔

کارہائے شیشہ تکمیل پذیر : انور ہال میں دروازوں اور کھڑکیوں میں لکڑیوں کے کام سے فراغت کو بہت پہلے ہوچکی تھی، تاہم کھڑکیوں اور روزنوں میں شیشے کا کام باقی تھا، الحمدللہ یہ مرحلہ بھی انجام کو پہنچا۔

برآمدے کی پی او پی مکمل : دارالحدیث کے تحتانی حصوں میں پی او پی کا اہم مرحلہ بھی بحمداللہ پورا ہوگیا۔ ابھی صرف چاروں طرف کے برآمدے کی پی او پی ہوئی ہے۔ چھت کا کام مکمل باقی ہے۔ ناظم تعمیرات کے مطابق جلد ہی اس اس میں بھی ہاتھ لگا دیا جائے گا۔

دارالحدیث کے دامن میں پتھروں کی تنصیب : دارالحدیث اللہ کے فضل وکرم سے تکمیل کے بے حد قریب ہے۔ سنگ مرمر لگنے تھے، پہلے ہی لگا دیئے گئے ہیں۔ عمارت کے دامن میں چاروں طرف بھی نہایت خوبصورتی سے پتھر جمائے گئے ہیں جس سے عمارت کا حسن مزید نکھر گیا ہے۔

✦.....❖.....✦

تبصرہ وتعارف

❖ **تبصرہ نگار**: مولانا عبدالرشید بستوی/استاذ حدیث جامعہ ہٰذا

کتاب : حضرت مولانا زبیرالحسن کاندھلویؒ کی سوانح حیات

تالیف : جناب مولانا سید زین العابدین کراچی و جناب مولانا انیس احمد مظاہری لاہور

صفحات : ۷۷۵ **ناشر** : اریب پبلیکیشنز، دہلی-۶

اشاعت : ۲۰۱۵ء **قیمت** : درج نہیں

تقریباً ایک سو سال پر محیط جابر وظالم برطانوی حکومت سے اسلامیانِ ہند کو بہ ہمہ وجوہ سنگین، خوف ناک اور ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچے۔ ان میں سے اقتدار واقتصاد کے تعلق سے جو گہرا زخم لگا، وہ تو ۱۹۴۷ء میں مغربی و مشرقی پاکستان کی صورت میں ایک علاحدہ ملک حاصل کر لینے کے باوجود، مندمل نہ ہوسکا۔ تاہم مسرت آگیں پہلو یہ ہے کہ دین وایمان کے تحفظ وبقا کا الہامی سامان ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے طرز وانداز پر قائم ہزاروں مدارس ومکاتب، نیز دعوت وتبلیغ کی اپنے آپ میں منفرد تحریک تبلیغی جماعت کی شکل میں۔ یہ عالمی دعوتی تحریک بھی دراصل دارالعلوم دیوبند کے ہی فیضان کا بابرکت تسلسل ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے نصاب ومنہاج سے ہم آہنگ مدارس نے محدثین، مفسرین، فقہاء ومفتیان، مجاہدین حریت، مناظرینِ اسلام، مشائخ سلوک ومعرفت، دعات ومبلغین، مقررین وواعظین، مصنفین ومؤلفین اور سیاسی وملی قائدین کی کھیپ کی کھیپ تیار کی اور کر رہے ہیں، وہیں دعوت وتبلیغ کی تحریک نے ناخواندہ، دین اور دین کی تعلیمات سے دور، عقائد ومسائل وفضائل سے نابلد، مختلف قسم کے جرائم میں ملوث، نیز متنوع سماجی شعبوں سے وابستہ مسلمانوں تک کلمہ پہنچایا، ان کو دین سے جوڑا، دین پر عامل بنایا، دین کے لیے مال ومتاع اور قیمتی وقت کی قربانی دینے اور دین پر فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرنے کا جذبہ دلوں میں بیدار کیا اور تاہنوز یہ مبارک سلسلہ پوری قوت کے ساتھ باقی، جاری وساری ہے۔ **اللھم زد فزد**.

دعوت وتبلیغ کے حوالے سے جن باتوفیق نمائندہ شخصیات نے بے مثال ولازوال قربانیاں اور خدمات انجام

دیں، ان میں بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب، ان کے فرزند حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، حضرت مولانا محمد عمر پالن پوری صاحب، حضرت مولانا عبیداللہ بلیاوی صاحب اور صاحب سوانح تبلیغی جماعت کے عالمی شورائی امیر حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ بہت امتیازی حیثیت وعظمت کے حامل ہیں۔

مؤخر الذکر حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب نے بیس سال تک تبلیغی جماعت کی شورائی امارت کی ذمے داری بہ احسن وجوہ انجام دی۔ اس دوران انہوں نے حالات کے جبر واکراہ کے باوجود، جماعت کو سابقہ منہاج سے ہٹنے نہ دیا اور وہ اکابر تبلیغ کے طے کردہ اصول کی روشنی میں ہی کارِ تبلیغ کا نظام چلاتے اور اس کا حلقۂ اثر دراز سے درازتر کرتے رہے۔ جماعت تبلیغ کے تعلق سے ان کی اس اہم کامیابی کی بابت، ان کے بچپن کے ساتھی محترم المقام حضرت مولانا محمد شاہد صاحب سہارن پوری رمد ظلہم ارقام کرتے ہیں ''وہ اپنے ہم عصروں اور دعوتی رفقاء میں اس لحاظ سے بھی امتیازی شان اور اعلیٰ حیثیت رکھتے تھے کہ حالات کے جبر اور ماحول کی تنگی وسختی کے باوجود، موصوف ایک لحظہ کے لئے بھی اس نہج ومنہج سے ہٹنے کو تیار نہ ہوئے جو دورِ الیاسی اور یوسفی اور دورِ انعامی میں اس عالمی محنت کے لئے قائم کر دیا گیا تھا۔ [کتاب ہذا، ایک عہد کا خاتمہ، ص: ۲۰]

حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب کی ولادت کی تاریخ ۱۹۵۰ء ہے، جب کہ وفات ۲۰۱۴ء میں ہوئی۔ اس طرح عمر موعود کچھ زیادہ لمبی نہ ہوئی، صرف چونسٹھ سال ہی حیاتِ مستعار لے کر آئے، لیکن کام اتنا کر گئے جتنا سو سال کی عمر پانے والے لوگ بھی عام طور پر نہیں کر پاتے۔ جب کام میں اخلاص اور جذبۂ صادق ہوتا ہے تو من جانب اللہ قبولیت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور بندوں کے دلوں میں محبوبیت گھر کر جاتی ہے۔ حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب کے جنازے کے ہجوم کو دیکھ کر سیدنا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ تاریخی جملہ یاد آجاتا ہے۔ ''**بيننا و بينهم الجنائز**''

الغرض! حضرت مولانا زبیر الحسن صاحبؒ کی زندگی پڑھنے پڑھانے، باطنی اصلاح لینے اور کرنے، کار دعوت کو سنبھالنے اور انجام دینے میں گذری۔ ان میں سے کون سا کام ہے جو کارِ نبوت سے ہم آہنگ نہ ہو اور کون سا وقت ہے جو ان کا ان کارہائے دین میں نہ گزرا ہو۔

ضرورت تھی کہ حضرت مولاناؒ کی حیات وخدمات پر وقیع کتاب تالیف کی جائے، دل کش اسلوب، حسین پیرایہ، دیدہ زیب کتابت اور خوبصورت طباعت کے ساتھ، مستند معلومات کی دستاویز، صاحبِ سوانح کی سراپا جدوجہد، عملی زندگی کے ہر گوشے سے نقاب کشا، دوسروں کے لئے سامانِ دعوت اور چشم کشا ہو۔

مقام مسرت ہے کہ پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ایک عظیم ضخیم کتاب، محترم مولانا سید زین العابدین صاحب، کراچی نے محترم مولانا انیس احمد صاحب مظاہری، لاہور کے تعاون اور گرامی قدر حضرت مولانا محمد شاہد صاحب سہارن پوری کی نگرانی ونظر ثانی کے ساتھ، چند ہی مہینوں میں مکمل کر لی۔

کتاب باب اول: دعوت وتبلیغ، باب دوم: حضرت مولانا زبیر الحسنؒ حیات وخدمات، باب سوم: حضرت اور ان کے افادات وملفوظات، باب چہارم: مولانا کی وفات پر دنیا بھر سے ملنے والے تعزیتی پیغامات وتاثرات، باب پنجم: مولانا پر لکھے گئے مقالات ومضامین، باب ششم: مولانا کے بارے میں عربی ادیبوں کے تاثرات، باب ہفتم: مولانا کو اخبارات ومجلّات کا خراجِ تحسین، باب ہشتم: تعزیتی مکتوبات، تواریخ وفات اور منظوم خراجِ تحسین جیسے اہم مرکزی اور بنیادی آٹھ ابواب ومباحث پر پھیلی ہوئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کتاب کے جملہ مندرجات درست اور مستند ہیں۔ کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کی اغلاط بھی شاید وباید ہیں، جب کہ یہ کتاب اولاً لاہور، پاکستان شریک مؤلف: جناب مولانا انیس احمد صاحب مظاہری کے مکتبہ سے اشاعت پذیر ہوئی، زیر تبصرہ نسخہ اریب پبلیکیشنز، دہلی اسی کا عکس ہے۔ کتاب کی تالیف، مواد و معلومات کی فراہمی، مضامین کی مربوط ترتیب میں محترم مولانا زین العابدین صاحب نے بڑی جگر کاوی اور جاں فشانی سے کام لیا ہے، شبانہ روز محنت کی ہے اور خوب سے خوب تر بنانے کے حوالے سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اتنا مستند، مکمل، مرتب اور مربوط تالیفی کام اس قدر جلد انجام دینے پر، مولانا موصوف ہم سب کی طرف سے بہ صد تبریک وتحسین کے بجا طور پر سزاوار ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

✦.....✦.....✦

کتاب : اعلیٰ حضرت بریلوی: حیات اور کارگزاریاں

مولف : جناب مولانا مفتی جمیل احمد صاحب نذیری/مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ، مبارک پور

صفحات : ۴۰۸ **تعداد اشاعت** : گیارہ سو **قیمت**: ۲۰۰/روپے

ناشر : مکتبہ صداقت، نوادہ، مبارک پور، اعظم گڑھ یوپی

جناب مولانا جمیل احمد صاحب نذیری زید مجدہم کا نام ہندوستان میں طبقہ دیوبند کے درمیان معروف ہے۔ فرقِ باطلہ کی تردید کی بابت مولانا کا قلم بہت پختہ، مطالعہ وسیع، استحضار حیرت انگریز اور قوتِ استدلال مسلم ہے۔ مولانا کی ایک سے زیادہ تالیفات اہل علم کے درمیان اعتبار واستناد کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی شاہ کار کتاب ''رسولِ اکرم صلی اللہ کا طریقۂ نماز'' فقہ حنفی کے مطابق مسائل نماز کی بابت کتاب وسنت سے ماخوذ دلائل کا انمول

ذخیرہ ہے۔غیر مقلدین کی طرف سے اب تک اس کتاب کے مندرجات جواب سامنے نہیں آسکا ہے۔

مولانا نذیری صاحب کی زیر تبصرہ کتاب بھی معلومات اور مندرجات کے حوالے سے نہایت مستند و معتبر ہے۔اس کتاب میں نذیری صاحب نے ''دیوبندی بریلوی اختلافات کی تاریخ، اعلیٰ حضرت کے حالاتِ زندگی، اعلیٰ حضرت کی گرم مزاجی، ایسا کیوں؟ دوسرے سفر حج کا مقصد زیارت الحرمین یا حسام الحرمین؟ اعلیٰ حضرت کا اندازِ تحریر، اعلیٰ حضرت کا مخصوص ذہن، اعلیٰ حضرت اور مسئلہ تکفیر، تبرکاتِ اعلیٰ حضرت، الملفوظ کی روشنی میں، اعلیٰ حضرت کا شوقِ کافرگری، فتاویٰ رضویہ: ایک تعارف، اعلیٰ حضرت کے متعلق علماء بدیوں ورام پور کی متفقہ آراء، اعلیٰ حضرت کا سفرِ آخرت، اعلیٰ حضرت کی علمیت، اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں عقیدت مندوں کے نذرانے، ایک نظر وصایا شریف پر اعتراضات کے جوابات پر، غلط فہمی میں کون؟ رضاخانی اور محبتِ رسول کا دعویٰ، سنیت کا دعویٰ بھی قابل غور، مسئلہ علم غیب اور رضاخانی علماء کی متضاد بیانیاں، شیعیت کے قریب تر قول وعمل کا یہ تضاد، رضاخانی علماء کے پاس نہ تنظیم نہ کام، دعوتِ اتحاد یا دعوتِ اختلاف، اعلیٰ حضرت سے منحرف بریلوی علماء، ایک اشتہار کا قابلِ مطالعہ مضمون، یہ ہیں علمائے دیوبند اور یہ ہیں ان کے عقیدے، مسلک اعلیٰ حضرت کو سمجھئے، ان کتابوں سے'' جیسے اہم اور بنیادی مباحث پر بڑی مدلل، مرتب اور مکمل گفتگو کی ہے۔

مولانا نذیری صاحب کا ذوق علمی اور قلم تحقیقی ہے، اس لئے کوئی بات علم وتحقیق کے معیار سے نہ فروتر ہے، نہ خالی، از حوالہ واستناد نہ ہی ضروری تفصیلات سے تہی دامن۔اس کتاب کے تمام مندرجات اہم اور لائق مطالعہ ہیں، بہ طور خاص اعلیٰ حضرت کا مخصوص ذہن، اعلیٰ حضرت کی گرم مزاجی، اعلیٰ حضرت کا شوقِ کافرگری، فتاویٰ رضویہ ایک تعارف، اعلیٰ حضرت کی علمیت اور سنیت کا دعویٰ بھی قابل غور'' جیسے مرکزی عنوانات کے تحت ذیلی مباحث اور ان کی تفصیلات نہایت اہم ہیں۔علاوہ ازیں یہ ہیں علمائے دیوبند اور یہ ہیں کے عقیدے'' اور اعلیٰ حضرت سے متعلق علماء بدایوں ورام پور کی متفقہ رائے'' بھی بہت چشم کشا اور مفید ہیں۔

کمپیوٹر کتابت اغلاط سے تقریباً پاک، طباعت صاف ستھری، کاغذ مناسب، ٹائٹل سادہ مگر دل کش ہے۔ کتاب کی علمی وتحقیقی اور معلوماتی پہلو کے پیش نظر، ہر صاحبِ ذوق سے اس کا مطالعہ کرنے کی بجا طور پر گذارش کی جاسکتی ہے۔امید ہے کہ یہ کتاب بھی مولانا نذیری محترم کی دیگر علمی کتابوں کی مانند علماء وطلبہ کے حلقہ میں مقبولیت حاصل کرے گی۔ان شاء اللہ!

✦.....❖.....✦